دِلرُبا
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو
قرۃ العین حیدر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

دِلرُبا

اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

DILRUBA

اِا

AGLAY JANUM MOHAY BITIA NA KIJIO

by

Qurratul-Ain-Haidar

Year of 1st Edition 2008
ISBN 81-8223-060-8

Price Rs. 60/-

نام کتاب	دلرُبا — اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو
مصنفہ	قرۃ العین حیدر
سنِ اشاعت اول	۲۰۰۸ء
قیمت	۶۰ روپے
مطبع	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail : ephdelhi@yahoo.com

1۔ پردہ گرنے کے بعد

''......رباب ستار پکھاوج سر سنگھار باج دھیان مان سے گمک تان سے تین گرام سے بجے سب باج ناچو نرت بتاؤ اور اڑاؤ گند ھر وراگ۔ مانی دھانی دھاپا ماگا رے سادھا کڑ تک دھاکڑ تک دھم کڑ تک دھان تک تھئی دھا کڑ تک تھئی......'' آخری پر شکوہ کورس کی گونج مدھم پڑی۔ عہد وکٹوریہ کے مکینیکل اسٹیج کرافٹ سے لیس شاہی دربار میں جمع زرق برق پوشاکوں سے جگمگاتی کاسٹ پر عنابی مخملیں پردہ آہستہ آہستہ گرا۔ باہر آکر ڈریس سوٹ میں ملبوس پارسی منیجر رستم جی پسٹن جی نے کمپنی کی طرف سے پبلک کا شکریہ ادا کیا اور اگلی رات کا پروگرام اناؤنس کیا۔ چونی والوں کی سیٹوں اور تالیوں کے شور میں ہال برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا۔ عنابی پلش کے ڈریس سرکل میں سے نکل کر شرفائے لکھنو زینہ اترنے لگے۔ ایک کونے والے ''لیڈیز بکس'' میں برقعہ پوشوں نے فوراً پردہ برابر کیا۔ چند منٹ بعد ان میں سے ایک نے باہر جھانکا' ہال خالی ہو چکا تھا۔ چاروں کا جلوس ''باکس'' سے برآمد ہوا۔ اس میں سے ایک نے گھبراہٹ میں شٹل کاک برقعہ اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ آنکھوں کی سفید جالی سر کے پیچھے تھی۔ چاروں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کیا۔ ایک سنسان کوریڈور میں سبز بانات سے منڈھے دروازے پر ''پرائیویٹ'' کی تختی لگی تھی۔ نیم وا کواڑ سے ٹکرا کر چاروں غڑاپ سے اندر۔
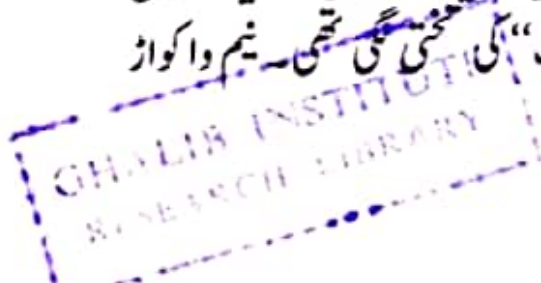
اپنے پرائیویٹ ڈریسنگ روم میں "ملکہ مہر" سنگھار میز کے سامنے بیٹھی نقلی زیورات اتارنے میں مشغول تھی۔ بلب سے روشن آئینے میں عجیب ماجرا نظر آیا۔ ایک نقاب پوش گھیر دار سفید برقعے میں ملفوف فرش پر ڈھیر۔ تین نقاب پوش دہلیز پر موجود۔

"اوئی اللہ......" "ملکہ مہر" دہل کے چیخی...... "کندن...... منو...... بہروپئے...... چور...... چور......" حاضر دماغی سے کام لے کر "نادر جنگ" کے قتل کے ارادے والے سین کا مصنوعی خنجر جو سنگھار میز پر رکھا تھا اٹھایا۔

فرش پر پڑی مخلوق برقعے میں الجھی ہاتھ پاؤں چلا کر آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ "ملکہ مہر" نے کڑک کر پوچھا "کون؟"

"ہم...... للو......" برقعے میں سے ایک کم سن آواز آئی "میڈم! ہم...... للو جی...... ہمیں نکالئے ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔" پھر ہاتھ پاؤں مار کر برقعے میں سے ایک پندرہ سالہ صاحبزادے بر آمد ہوئے۔ "ملکہ مہر" کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔ اب بقیہ تینوں کی ہمت بڑھی اور انہوں نے نقاب الٹے تینوں کے رنگ فق۔ ان میں سے ایک نے اسکول کی کاپیاں ہاتھ میں بڑی احتیاط سے سنبھال رکھی تھیں۔ جہاندیدہ تجربہ کار تھیٹر والی نے سوچا بھنورے میں پلے شریف زادے۔ ماں باپ سے چھپ کر ناٹک دیکھنے آئے ہیں۔ یہ لکھنو ہے یہاں جو بھی نہ ہو کم ہے۔ کسی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ اس طرح مبہوت کھڑے تھے گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو کہ اتنی مشہور ہیروئن کے ڈریسنگ روم میں موجود ہیں۔

"بیٹھ جاؤ......" ہیروئن نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ چاروں برقعوں سمیت صوفے پر ایک قطار میں بیٹھ گئے۔ "ملکہ مہر" نے خنجر میز پر رکھ کر اٹراف روزیز اپنے اوپر چھڑکا اور اطمینان کی سانس لی۔ پھر اسٹول پر بیٹھ کر پکاری۔ "کندن...... حرام زادی...... چھنال...... کہاں مر گئی؟"

لڑکوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے خوابوں کی ملکہ......

نیو الفریڈ کمپنی کی چیف ایکٹریس، صید ہوس کی نامور اداکار گلنار بائی اناوے والی، بھڑ بھو نجنوں، بھٹیارنوں کی طرح گالیاں دے رہی تھی۔

ایک ٹری شکل والی عورت کمرے میں گھسی۔ لال لہنگا، نیلا شلوکہ، ہرا دوپٹہ، ناک میں بلاق، خاصی بندریا۔ مسخ، پھٹکار زدہ صورت۔ گلنار بائی اس پر برس پڑیں...... "کلموہی...... مال زادی...... میں یہاں لٹ جاؤں۔ ڈکیت آن پڑیں، ٹھگ آن گھسیں۔ کھیل ختم ہوا نہیں اور تم سب چرس کا دم لگانے بیٹھ گئے۔ دروازہ کس نے کھلا چھوڑا؟...... ارے یہ تو خیر اسکول کے چھوکرے نکلے۔ چور بدمعاش اچکے ہوتے تو؟...... اور منڈوے کے چوکیدار سب انفلوئنزا میں مر گئے کیا......؟ منوا بھسم ہو گیا...... ؟ اس کی گور میں کیڑے پڑیں۔ ڈھائی گھڑی کی آئی۔ مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو......"

کندن نے جلدی سے بید مشک پیش کیا۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا گھنگھریالے بالوں والا لڑکا جو شکل سے گلنار کا بھائی معلوم ہوتا تھا، اندر آیا......

"باجی...... باجی...... کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"منوا کے بچے...... حرام زادے...... بھڑوے...... دروازہ تو کھلا چھوڑ گیا تھا؟"

چاروں برقعہ پوش بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ جگہ تو بھنگڑ خانہ نکلی اور مس گلنار نکیہائی۔

"بیٹھ جائیے آپ لوگ......" گلنار نے گرج کر کہا۔ "جاتے کہاں ہیں۔ اپنا پتہ نشان بتا کر جائیے پوچھ تاچھ کے لیے کل کلاں آپ کے باوا آ کر میرے سر پر سوار ہوئے تو ان کو کیا جواب دوں گی۔ او کندنیا...... بابا لوگ کے لیے سوڈا لیمن لا۔"

"باجی! پسٹن جی کو بلاؤں......؟" منوا نے مستعدی سے دریافت کیا۔ وہ لال لال آنکھوں سے برقعہ پوش لڑکوں کو گھور رہا تھا۔

"بھاگ جا بے...... حرام کی اولاد......" گلنار نے بالوں کا نقرئی برش اس

کی طرف غصے سے پھینکا۔ "دروازے پر بیٹھ جاکر اپنے اسٹول پر۔ کوئی ان بچوں کو ڈھونڈ تا آئے تو مجھے اطلاع کرنا۔"

"بہت اچھا باجی......" منوا سر جھکائے جاکر باہر اپنی ڈیوٹی پر بیٹھ گیا۔

کندن نے نیلے پھولدار گلاسوں میں سوڈا لیمن لڑکوں کو پیش کیا۔

"باہر جاؤ......" گلنار نے حکم دیا۔

کندن بلاق کے نیچے مسکراتی لہنگا بھڑکاتی گلیارے میں چلی گئی۔ گلنار نے کواڑ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔

کندن کوریڈور میں نکلی۔ پھسکڑ مار کے منوا کے اسٹول کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ شلوکے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا ایک خود سلگائی دوسری منوا کو دی۔ پھر گلے میں لٹکے چاندی کے خلال سے دانت کریدتے ہوئے بولی......"اب کے بہت ننھے مرغے پھنسے ہیں۔ کسی کی مونچھوں کا کونڈا بھی نہیں ہوا اب لگ۔ نخلئو کے نابالغ نواب زادے...... برقعے اوڑھ کر گلو سے ملنے آئے...... کھی کھی کھی......قہ......قہ......قہ۔"

ڈریسنگ روم کے اندر گلنار بائی عرف گلو جان کو دروازے کی چٹخنی لگاتے دیکھ کر وہ چاروں لڑکے بالکل حواس باختہ ہو چکے تھے۔ بار بار دل میں کہہ رہے تھے۔ برے پھنسے بہت برے پھنسے اور سب اپنے اپنے بزرگوں کے ہاتھوں بید سے پٹنے کا تصور کرنے میں کھوئے بیٹھے تھے۔

اتنے میں ایک جادوگرنی نما ادھیڑ عورت اندرونی دروازے سے کمرے میں آئی۔

"اب یہ بڑھیا ہمیں مکھیاں یا بکرے بنادے گی۔" ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

جادوگرنی گلنار بائی اور منوا کی ہم شکل تھی۔ گھنگھریالے کھچڑی بال بڑی بڑی آم کی پھانکوں جیسی آنکھوں میں کاجل۔ ناک میں ہیرے کی لونگ۔ دائیں بازو پر تعویذ۔ چھینٹ کی اننگی ساری۔ پاؤں میں سلیپر عجب قطع تھی۔ اس نے

چیل کی سی نظروں سے لڑکوں کو گھورا اور بولی۔ "اس منوا کے بچے کو تو پیسے پر رکھ کر ماروں۔"

"آپا تم ذرا باہر جاؤ۔ ابھی بلاتی ہوں۔" گلنار نے کہا۔ عجوزہ نامعقول یہ سنتے ہی فوراً غائب ہو گئی۔ گلنار اپنے زیور اتارتی گئی اور لڑکوا ، سے مخاطب ہوئی۔

"اب فرمایئے آپ کا اسم شریف؟ اس نے سب سے بڑے لڑکے سے پوچھا جس نے وقار کے ساتھ جواب دیا "بندے کو برج بہاری لعل ماتھر کہتے ہیں۔"

"بو...... بوم کہلاتے ہیں......" بیو قوف للو نے فوراً کرکری کر دی اور بولے "ہم گھنشیام داس رستوگی عرف للو...... اور یہ ننھے...... اور یہ ہمارے شجو بھیا......"

"سید شجاعت حسین تعلقدار کریم پور ضلع ہردوئی۔" بو نے سلسلہ تعارف دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے کر متانت سے کہا۔

گلنار فوراً تاڑ گئی یہ بھولے بھالے شجو میاں باپ کی جواں مرگی کی وجہ سے تعلقدار ہو چکے ہیں یہ تینوں ان کے مصاحبین ہیں۔

"آپ کے قانونی سرپرست کون ہیں؟" گلنار نے شجو سے دریافت کیا۔

شجو نے سراسیمہ امداد طلب نظروں سے بو جی کو دیکھا۔

"ماموں...... سید رفاقت حسین۔ بیرسٹر۔ تعلقدار بارہ بنکی۔ آج کل چھنامل والوں کے مقدمے کے لیے دلی گئے ہوئے ہیں۔" بو جی نے بتایا۔

"اوہو...... بیرسٹر صاحب کا تو ہم نے نام سنا ہے۔ اخبار میں فوٹو بھی دیکھے ہیں۔ اچھا تو وہ شہر میں موجود نہیں۔ اسی لیے آپ لوگ ناٹک دیکھنے چلے آئے۔ یہ برقعے اوڑھنے کی ترکیب کس نے سجھائی......؟" گلنار نے دفعتاً ہنس کر خوش خلقی سے پوچھا۔

"ہم نے راز عشق در خفیہ پولیس عرف گنجینہ سراغ رسانی کتاب میں پڑھا تھا......" للو جی نے ارشاد کیا۔

"اور آپ کے والد......؟" گلنار نے ببو جی سے پوچھا جو چاروں لڑکوں میں سب سے تیز فہم اور ہوشیار معلوم ہوتے تھے۔

"ہمارے والد...... مسٹر کنج بہاری لعل ماتھر۔ بیرسٹر ایٹ لا۔"

"ماشاء اللہ اور آپ......؟" تیسرے لڑکے سے پوچھا۔ وہ گھبرایا ہوا چپ بیٹھا رہا۔ ببو نے پھر کہا۔ "ان کا نام ننھے ہے۔ ان کے فادر شیخ رشید احمد اودھ پنچ اخبار میں کام کرتے ہیں۔"

"یہ......؟"

اس نے للو کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ببو نے جواب دیا "للو کے فادر رفاقت حسین چاچا کے رستوگی ہیں گے۔"

گلنار نے سوالیہ نگاہوں سے ببو جی کو دیکھا۔ وہ لکھنو پہلی مرتبہ آئی تھی۔

"ہمارے پتاجی جو ہیں......" للو نے بڑے وقار کے ساتھ تشریح کی۔ "وہ رفاقت حسین صاحب کے علاقے کے منیجر ہیں۔"

"اسکول جاتے ہو؟"

"جی ہاں......" ببو بولے۔ ہم لا مارٹینئر میں ہیں۔ ججو کالون تعلقدارز سکول میں اور ننھے امیر لدولہ جاتے ہیں۔"

گلنار نے دوبارہ للو اور ننھے پر نظر ڈالی۔ دونوں مسکین سے بچے ججو میاں اور ببو جی سے کم حیثیت معلوم ہوتے تھے۔

"یہاں کیسے آئے؟"

"گھر کی بگھی ہے۔" للو جی نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے اسٹیج کے پیچھے کیسے آ نکلے؟" گلنار نے پاندان اپنی طرف سرکا کر پوچھا۔

"باہر جانے کے لیے خفیہ راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ سراغ رسانی کی کتاب

میں پڑھا تھا۔" للو جی نے فرمایا۔

"ہم امی جان کی اجازت سے آئے ہیں۔" شجو نے جی کڑا کر کے پہلی بار بات کی۔ "برقعے اس لیے اوڑھے کہ یہاں ہمارے ماموں میاں یا ماتھر چاچا کا کوئی جان پہچان والا نہ دیکھ لے اور ہمیں گھر لے جانے کے لیے ہمارے آدمی آویں گے۔ وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوں گے۔ اجازت دیجئے۔"

گلنار کو اب لطف آرہا تھا۔ کہنے لگی۔ "بیٹھو میاں۔ گھبراؤ نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے تمہارے آدمی سیدھے یہاں پہنچا دیئے جائیں گے۔ پان کھاتے ہو؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"سگریٹ تو پینا نہیں شروع کیا...... مت پینا۔ بری عادت ہے۔"

لڑکے حیران و پریشان گلنار بائی کی صورت دیکھا کیے۔ یہی بی صاحب چند منٹ پہلے اپنے لواحقین کو گالی کوسنوں سے نوازتی کتنی بازاری اور لچر معلوم ہو رہی تھیں۔ پل کی پل میں دوسرا ماسک پہن لیا۔ خوش اخلاق، مہذب، شفیق۔ ان کم عمر لڑکوں کو ابھی تجربہ نہ ہوا تھا کہ انسان کی شخصیت کے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کے اندر کتنی مختلف اور متضاد ہستیاں چھپی رہتی ہیں اور بعض لوگ موقع و محل کے لحاظ سے کس طرح اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ گلنار بائی کی اصلیت کیا تھی...... ؟ بازاری یا شریف؟ غالباً دونوں...... اور یہ بات شاید خود اسے معلوم نہ تھی۔

بڑی نفاست سے پان کی گلوریاں بناتے بناتے اس کی نظر ان کاپیوں پر پڑی جو للو احتیاط سے سنبھالے بیٹھے تھے۔ اس نے دریافت کیا۔ "اسکول سے سیدھے یہاں آرہے ہو؟"

"جی نہیں...... ہم اور شجو بھیا جو مکالمے اور گانے اچھے لگتے ہیں ان کو لکھ لیتے ہیں۔" للو نے جواب دیا اور سنگھار میز پر رکھے مصنوعی خنجر کو بڑی عقیدت سے دیکھا جو گلنار نے فوراً اٹھا کر انہیں دے دیا۔

للو اور شجو بڑے انہماک سے اسے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔

"اے چھری اچھی چھری دے ساتھ گر تو ساتھ ہے...... میں بھی عورت ذات ہوں اور تو بھی عورت ذات ہے......" شجو نے دہرایا پھر فوراً جھینپ گئے۔

"سبحان اللہ...... خوب حافظہ ہے۔" گلنار نے تعریف کی۔ "تھیٹر میں کام کرنے کو جی چاہتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ناممکن۔ غلط بات ہے۔" بو نے جو عمر میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے اس وقت خود کو ان احمق چھوکروں کا گارجین سمجھ رہے تھے' جھنجھلا کر کہا۔

گلنار ذرا برا مان گئی۔ "کیوں؟ بنگال میں بڑے بڑے رئیس زادے ناٹک میں کام کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"بنگال کی بات بنگالی بابو جانیں۔ ہمیں ان سے کیا غرض؟" بو نے جواب دیا۔

"آپ کی طرف کے بھی ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ حافظ عبداللہ۔ انہوں نے اپنی کمپنی قائم کی ہے۔ خود ایکٹنگ کرتے ہیں اور کتنے شریف زادوں کے نام گنادوں؟"

"جی ہاں۔ ان کے ماما کو یہی تو فکر ہے کہ یہ حضرت بھی اسی رنگ میں نہ رنگ جاویں۔"

گلنار کی ہمت افزائی کی وجہ سے شجو اب خود کو بہت دلیر محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بو جی کو نظر انداز کر کے ایکٹریس سے کہا "ہم تو آغا صاحب کے سارے ناٹک پہلے کتاب میں پڑھ لیتے ہیں صید ہوس کا تو ہمیں ایک پورا سین زبانی یاد ہے۔ سنئے گا؟"

"ضرور ضرور......" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

شجو میاں اٹھے۔ کھنکارے اور ہاتھ لہرا کر آغاز کیا۔ "جب قید خانے میں بچہ شہزادہ کہتا ہے...... نہیں...... نہیں...... نہیں...... قزل مجھے بند ھواؤ نہیں۔ میں شور نہیں کروں گا.. بھیڑ کی طرح بیٹھا رہوں گا۔ قزل بولا۔ خاموش۔ شہزادہ قیصر بولا ہلوں گا بھی نہیں۔ غریب گائے کی طرح شور بھی نہیں کروں گا اور لوہے کی طرف غصے سے بھی نہ دیکھوں گا۔ تم جو دکھ دو گے معاف کر دوں گا۔ پھر بولا۔ پھر بولا...... دیکھو میری بے گناہ آنکھوں کو روتا دیکھ کر لوہا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ قزل بولا...... میں اسے پھر گرم کروں گا۔"

کمسن شہزادے کی ٹریجڈی یاد کر کے شجو' للو' ننھے تینوں بہت ملول ہو گئے۔ گلنار بڑی انسیت سے ان کے بھولے چہروں کے تاثرات دیکھا کی۔ اسے ایسے سیدھے سادے بے غرض مداحوں سے آج تک سابقہ نہ پڑا تھا۔

دروازے پر دستک۔ اس نے اٹھ کر چٹخنی کھولی۔ مسٹر رستم جی پسٹن جی منیجر نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کی طویل ناک ظاہر ہوئی۔ پھر پورا چہرہ۔ پھر خود۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک ایرانی ٹوپی۔ کھچڑی مونچھیں۔ ٹوٹی عینک۔ سیاہ شیروانی۔ دوسری دو پلی ٹوپی۔ سفید مونچھیں۔ دھاگے سے بندھی عینک۔ سفید انگرکھا۔ دائیں ہاتھ میں لپٹی تسبیح عقیق۔ انگلیوں میں فیروزے کی نقرئی انگوٹھیاں۔ گلنار نے دونوں حضرات کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ واقعی لکھنو کو جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا۔ ایک سے ایک رنگارنگ افسانوی کیریکٹر۔

"ینگ راجہ صاحب آف کریم پور کا اے۔ ڈی۔ سی۔" پسٹن جی نے مرعوب آواز میں گلنار کو مطلع کیا۔ "ان کو گھر لے جانا مانگتا۔"

اس اثنا میں جادوگرنی نما بڑھیا کمرے میں آکر مونڈھے پر بیٹھ چکی تھی۔ راجہ صاحب کریم پور کا نام سنتے ہی مارے ادب کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ زمانہ گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جب وہ خود اور اس کی بہنیں' بھانجیاں نوابوں کے سامنے کھڑے گانا سناتی تھیں۔ انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ گلنار بھی متاثر نظر آئی۔ تو یہ شجو میاں چھوٹے موٹے زمیندار نہ تھے باقاعدہ راجہ صاحب

تھے۔اس خاندان کے مردوں سے راہ و رسم پیدا کرنا ضروری ہے۔

دونوں "اے۔ڈی۔سی" کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ایرانی ٹوپی والے نے بڑی بی پر نظر ڈال کر دوپلی ٹوپی والے سے سرگوشی کی۔ "اوہو۔یہ تو گلنار بائی کی والدہ ہیں۔ گلزار بائی۔ یہ بھی اپنے زمانے کی نامی ایکٹریس تھیں۔ ہم ان کے ناٹک دیکھ چکے ہیں۔ یہ بہت قدیم ہیں۔"

گلنار نے پان کی نقرئی تھالی پیش کی۔ کمرے میں مؤدب خاموشی طاری تھی۔ (بو جی نے سوچا۔ یہ اے ڈی سی کی ایک ہی رہی۔ یہ لطیفہ میر حقہ کا معلوم ہوتا ہے۔ بو نے دو پلی ٹوپی اور انگرکھے والے بزرگ کا تعارف گلنار سے کرایا...... "میر ناصر رضا صفوی......"

گلنار نے جھک کر تسلیم عرض کی۔

مرزا عباس قلی بیگ قزلباش ایرانی ٹوپی والے کا نام تھا۔ گلنار کورنش بجا لائی۔

مرزا عباس قلی بیگ قزلباش...... میرا نام رضا صفوی...... کیا شاندار شاہانہ نام تھے مگر دونوں دھان پان مسکین رنجیدہ صورت۔ خستہ حال۔

"اور بائی صاحب ہمارے القاب بھی سن لیجئے۔ مرزا گزگزی اور میر حقہ......" ایرانی ٹوپی والے نے کہا۔ گلنار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ذرا بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوا۔ گلنار سمیت تمام حاضرین محفل کو علم نہ تھا کہ مرزا عباس قلی بیگ عرف مرزا گزگزی اور میر ناصر رضا صفوی عرف میر حقہ دونوں صاحبان ایران و ہند کے بالکل آغا حشر کی سی گھن گرج والے ماضی کی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔

گلنار بائی' جو اپنے طبقے اور اپنے ماحول کے لحاظ سے بہت ذہین اور حساس لڑکی تھی' کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ تھیٹر ہال یا منڈوے کی اسٹیج تو خیر ہئی...... جس میں مشینوں کے ذریعے پریاں اوپر سے اتاری جاتی ہیں۔ برقی روشنی طرح طرح کے تاثر پیدا کرتی ہے۔ رنگ برنگی "شاہی" پوشاکوں سے طلسم باندھا جاتا ہے۔ مگر نیا کا منڈوا اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ انگریزی داں پارسی ایکٹر ماسٹر بہرام

فیروز نے ایک مرتبہ اسے بتایا تھا کہ ولایت والا شیکسپیئر جس کے ڈراموں کے اردو چربے ہم لوگ پیش کرتے ہیں' یہی بات بہت پہلے کہہ گیا ہے۔

گلنار بائی' ماسٹر فیروز' پسٹن جی کے ہزار ہا شائقین اور تماشائی' سارا ہندوستان جنت نشان' اردو پارسی تھیٹر کی مانند ایک ANACHRONISTIC تماشا تھا اور زمان و مکاں کی قیود سے آزاد۔ جس طرح پارسی اسٹیج پر ہریش چندر' نل د مینتی اور چندر اولی' غزلیں اور رستم و سہراب شیریں و فرہاد ہندی بھجن گاتے تھے۔ عہد چنگیز خان میں جنگ ٹرانسوال کا ذکر ہوتا تھا اور ''عرب و عجم'' اور ''ہند قدیم'' کے مسخرے کردار وکٹورین میوزک ہال کی مقبول دھنوں پر باندھی ہوئی ''چیزیں'' الاپ کر ادودھم مچاتے تھے۔ ہندوستانی مزاج زمان و ماں کی قیود سے بے نیاز و آزاد ہر تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیار تھا۔ قدیم سنسکرت رنگ بھوم کے قوانین مسخروں کے ذیلی پلاٹ نوٹنکی کے مانند گانوں کی فراوانی۔ ایران و توران کے EPICS کی شان و شوکت' STYLISED اداکاری اور وکٹورین میلوڈراما کا یہ معجون مرکب جو اردو تھیٹر کہلاتا تھا' پچھلے ساٹھ ستر برس سے کولونیل ہندوستان کے خواص و عوام کا محبوب ترین سرمایہ تفریح تھا اور اسی اردو پارسی تھیٹر کے سارے لوازم اور خصوصیات آج کے پچاس سال بعد تک کی ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اسی طرح دائم و قائم رہنے والی تھیں' کیونکہ ہندوستان زمان و مکاں کی قیود سے آزاد تھا۔

آج اس وقت گلابی جاڑوں کی اس خوشگوار رات رستم و سہراب کی ذرا مضحکہ خیز ٹریجک نسلی یادگار بے چارے گجراتی پارسی رستم جی پسٹن جی جو جام جمشید کی تلچھٹ کی بھی تلچھٹ کی ایک بوند تھے' جب بیچارے شجو کو بڑے شیکسپیئرین انداز میں ''گڈ نائٹ ینگ پرنس'' کہہ کر باہر گئے تو فیوڈل عیش پرستی کی یادگار گلزار بائی نے دل میں سوچا...... لکھنؤ میں دوسری ہی رات ایک نوابی خاندان سے گلو کی ملاقات...... نیک شگون ہے...... انہوں نے بیٹی کا نقلی تاج بازو بند اور چندن ہار سمیت کر الماری کا پردہ سرکایا۔ اس میں نقلی تلواروں کا ڈھیر کونے میں

رکھا تھا' لڑکے بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگے۔

"بھیا اب گھر چلیئے۔" میر حقہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے اٹھتے ہی، سب فوراً کھڑے ہوگئے۔ گلزار و گلنار سمجھ گئیں...... شجو میاں کے ذاتی عملے کی اہم ترین ہستی یہی ہیں۔

"یہ تلوار تو ماسٹر اختر آفندی چلارہے تھے۔" شجو ایک تلوار تبرک کے مانند چھو کر بولے۔

"میر صاحب" گلنار نے میر حقہ سے کہا۔ "اگر مناسب سمجھیں تو صاحبزادے کو تھوڑی دیر کے لیے کل تیسرے پہر ہمارے ہوٹل لے آئیں۔ انہیں ماسٹر اختر آفندی اور ماسٹر بہرام فیروز دونوں سے ملوادیں گے......"

"اختر آفندی اور بہرام فیروز......؟" لڑکوں نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔

2۔ پام کورٹ ہوٹل

امین آباد کی ایک معقول مہمان سرائے تھی' جس میں بیرونجات کے شرفاء اور وہ متمول قدامت پسند ہندوستانی جنٹلمین جو برلٹن میں انگریزوں کی موجودگی سے گھبراتے تھے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ کشادہ ہوادار کمرے' چپس کے فرش' چینی کے گملوں میں پام کے سرسبز پودے' مرغن لکھنوی کھانا۔ نیو الفریڈ کا سینئر سٹاف یہاں مقیم تھا۔ اس وقت سب گلنار کے کمرے میں جمع تھے۔ سنگ مرمر کے وسطی میز پر نیلے بلوری گلدان میں گلاب کے پھول مہک رہے تھے۔ ایک گوشے میں پیڈل سے چلانے والا فولڈنگ ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف چاندنی بچھی تھی' جس پر گلزار بائی کے بیٹے اور گلنار کے برادر خورد منو عطا محمد چٹی ماسٹر کے ساتھ بیٹھے پیالیوں سے طشتریوں میں انڈیل کر چائے نوش کر رہے تھے۔ منشی افسوس (جو مکالمے یاد کرواتے تھے) دیوار سے ٹیک لگائے مطبع نولکشور کا تازہ ترین ناول "چابک سوار معشوقہ" پڑھنے میں محو تھے۔ سفید تنگ پاجامے'

کرتے، دوپٹے میں ملبوس گلنار مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کروشیا بن رہی تھی اور گھریلو لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسی شریف صورت لڑکی اتنی بیہودہ گالیاں بھی بکتی ہے، چاروں لڑکوں نے ایک بار پھر تعجب سے سوچا۔

ماسٹر اختر آفندی بید کی کرسی پر ترچھے لیٹے بیڑی پی رہے تھے۔ ان کے نزدیک بیٹھے مرزا گڑ گڑی نے منشی افسوس سے بڑی جانکاری کے لہجے میں دریافت کیا "آغا حشر صاحب کمپنی کے ساتھ تشریف نہیں لائے؟"

منشی افسوس نے کان کی لو چھوئی اور جواب دیا "جی نہیں آج کل کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں۔"

مرزا گڑ گڑی دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ چاروں لڑکے مع میر حقہ چاندنی پر بیٹھے گلزار بائی کی لچھے دار گفتگو سننے میں مصروف تھے۔ گلزار بائی کی شخصیت بھی آج کل مختلف معلوم ہو رہی تھی۔ کل جادوگرنی لگ رہی تھی۔ آج انہوں نے سفید چوڑی دار پاجامہ ڈوریے کا کرتا اس پر مخملیں صدری، ہلکا آبی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ بال بھی قاعدے سے سمیٹے تھے۔ تعویذ بازو سے اتار کر چوٹی میں لٹکا لیے تھے۔ چوہے دتیاں، ہیکل اور بالی پتے پہنے بالکل گلابو شتابو بنی بیٹھی تھیں۔ چائے کی کشتیاں اور کیک پیسٹری، دال موٹھ، سموسے اور بنگالی مٹھائی کی پلیٹیں چار طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ایک پیسٹری منہ میں رکھ کر جبڑے چلاتی رہیں۔ "اے بیٹا ہم تو اناوے کے ڈیرے دار ہیں۔" انہوں نے اس انداز سے کہا گویا اناوے کی صوبیدار ہیں۔ پھر دال موٹھ پھانکی، بہت پیٹو تھیں اور مستقل کھا رہی تھیں۔

گلنار نے کروشیا سے پیٹی کوٹ کی چوڑی لیس بنتے بنتے نگاہ اٹھا کر حاضرین جلسہ کو دیکھا۔ اسے میر حقہ پسند نہیں آئے تھے۔ اکھل کھرے، جلی کٹی باتیں کرنے والے بگڑے دل جانے کون سا تخت و تاج چھوڑ کر آئے ہیں جو یہ دماغ ہیں۔ مرزا گڑ گڑی البتہ دل چلے شوقین مزاج آدمی تھے۔ اب وہ گلزار بائی سے کہہ رہے تھے۔

"بی صاحب ہم نے تو سن اٹھارہ سو پچانوے میں آپ کا ناٹک نل ودمن دیکھا تھا اسی لکھنو کے اندر۔"

بائی صاحب کو اپنا اس طرح DATED ہونا پسند نہ آیا۔ ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔ "میں تو بارہ سال کی عمر میں وکٹوریہ ناٹک کمپنی کی ہیروئن بن گئی تھی۔ خورشید بالی والا کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔"

خورشید بالی والا کے نام پر ماسٹر اختر آفندی نے اپنے کان کی لو چھوئی۔

"پھر اپنی طرف کی لائٹ آف انڈیا تھیٹر کمپنی میں کام کیا۔"

"وہی آگرے والی کمپنی جس کے منیجر حافظ عبداللہ تھے؟" مرزا گڑگڑی نے پوچھا۔ ان کی معلومات قابل رشک تھیں۔

"ان حضرت نے کلام پاک حفظ کرنے کے بعد اچھا کام کیا۔" میر حقہ بڑبڑائے۔

"سارے انڈیا کا دورہ کر چکی ہوں۔ رنگون تک ہو آئی"۔ گلزار بائی کہتی رہیں۔

"آپ کا وہ گانا...... جب دمینتی جنگل میں گاتی ہے...... آہاہا...... ہمیں اب تلک یاد ہے۔ ہم کا چھاڑ چلے مہاراجہ ایسے اجاڑ بن میں......" مرزا گڑگڑی نے سر ہلایا۔

گلزار بائی نے ابرو سے پیٹی ماسٹر کو اشارہ کیا۔ وہ ہارمونیم پر تیز تیز انگلیاں چلانے لگا۔ منو نے بایاں ہتھوڑی سے ٹھونکنا شروع کیا۔ گلزار بائی نے بیٹے سے کہا۔ "تال پشتو" پھر سامعین کو مخاطب کیا۔ "نل ودمن کی ایک غزل پیش خدمت ہے۔" اب انہوں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کیا۔

"ارے ہجر کی آگ سے گھر دل کا مرے خاک ہوا...... ایسا بے لاگ جلا
لگ گئی آ کے مجھے عشق صنم کی جو ہوا...... کیا لگے کوئی دوا......"

مرزا گڑگڑی نے ہر شعر پر جھوم جھوم کر داد دی۔ گانے کے بعد گلزار بائی نے کہا" پنڈت جی...... طالب بنارسی۔"

منشی افسوس نے پھر دائیں کان کی لو چھوئی۔

ہو.جی نے پوچھا" آپ کی والدہ بھی ایکٹریس تھیں؟"

"نہیں میرے لعل...... میں تو بہو کی اولاد ہوں۔"

"جی...... ؟" للو.جی نے تشریح چاہی۔

"اماں ہماری...... اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ سات پردوں میں رہتی تھیں۔ دادی مشہور گائیکا تھیں۔ غدر سے پہلے تو ڈھا کے تلک بلوائی گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے "بلبل بیمار" میں کام کیا۔"

"سو پشت سے ہے پیشہ...... " میر حقہ بولے۔ گلزار بائی نے جو چاء کے بجائے وہسکی نوش جان کر رہی تھیں' ایک گلاس میر صاحب کو پیش کیا۔

انہوں نے تنک کر کہا" بی گلزار صاحب ہم نے تو آج تک اس شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"نہیں لگایا تو برا کیا...... " وہ دوبارہ دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ کی خلد آشیانی جنت مکانی عصمت ماب مادر گرامی ہمیشہ پس پردہ چراغ خانہ رہیں؟" ہو.جی نے دریافت کیا۔ کائیتھ بچے تھے۔

"اے بیٹا ہماری برادری کا یہی قانون ہے ہماری بہوئیں پردے میں رہیں ہیں' ہم اصل نسل ڈیرے دار ہیں' سنا ہے ہماری سگڑ دادی میران پور کڑے کی لڑائی پر گئی تھیں۔"

لڑکوں نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آپ کی سگڑ دادی جنگ میران پور کڑہ میں کام آئی تھیں؟ کس کی طرف سے؟" میر حقہ نے تجاہل عارفانہ سے استفسار کیا۔ "وارن ہیسٹنگز؟ شجاع الدولہ؟...... حافظ رحمت خان...... ؟"

گلزار بائی نے اب انہیں نظرانداز کر دیا لڑکوں سے مخاطب رہیں۔

"میاں ہمارے ڈیرے چلتے تھے نوابوں کے لشکر کے ساتھ۔ میدان جنگ میں

نواب کا لعل خیمہ' جرنیلوں امیروں وزیروں کے خیمے...... پھر ہمارے......"

شجو نے معصومیت سے دریافت کیا

"تو آپ لوگ جنگ میں جا کر لڑتی تھیں؟"

ان کے مشیر خاص ببو جی نے کان میں کہا۔

"اماں گھاس کھا گئے ہو۔ چپ رہو۔ ابھی جرمن کی لڑائی سے ہمارے ڈاکٹر جیجا جی لوٹے ہیں۔ وہ پاپا کو بتا رہے تھے کہ ولایت میں بھی FOLLOWERS CAMP ہوتی ہیں۔"

"میم لوگ بھی...... پتریا ہوت ہیں؟" للو زور سے بول پڑے۔ اسی وقت ماسٹر فیروز کمرے میں داخل ہوئے۔ سفید برجس' اودا دھاری دار کوٹ' گلے میں سرخ رومال گل مچھے' سرخ آنکھیں بہرام فیروز بڑی گھن گرج والے رول ادا کرتے تھے مگر اصلیت میں ان کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو انتہائی پارسی تھا۔ لڑکوں نے حیرت سے ان کی اڑنگ بڑنگ بھیا اردو سنی۔ چند منٹ بعد باہر چلے گئے۔ منشی افسوس نے مرزا گڑگڑی کو بتایا۔ "پہلے یہ بینظیر مون لائٹ آف انڈیا تھیٹر کمپنی میں تھے۔"

ہم بنائیں گے بے تدبیر سن لائٹ سوپ آف انڈیا تھیٹر یکجی۔ میر حقہ نے سوچا اور دوزانو بیٹھے منظر کا مطالعہ کیا کیے۔ میر ناصر رضا صفوی کی قسمت میں منشی گیری لکھی تھی ورنہ اودھ پنچ کے کالم نویس ہوتے۔ میر صفوی اور مرزا قزلباش عرف گڑگڑی دونوں بیرسٹر رفاقت حسین کے کلرک تھے۔

"ارے صاحب! ہم تو آپ کے ناچ کی تعریف ننوا بچوا سے سن چکے ہیں۔" مرزا گڑگڑی نے اب گلنار سے خطاب کیا۔ ننوا بچوا کے نام پر دونوں ماں بیٹیوں نے اپنے کانوں کی لویں چھوئیں۔ گلزار بائی سموسے کی پلیٹ صاف کرنے میں جٹ گئیں۔ کمرے میں دفعتاً خاموشی چھا گئی۔ ماسٹر اختر آفندی نے جو بے حد کم سخن تھے' ایک اور بیڑی سلگائی۔ گلنار نے مسہری کے پاس میز پر پڑا ایک پرانا پائنیر اخبار اٹھایا۔ شجو کو اشارے سے بلا کر پچھلے صفحے پر چھپی ایک تصویر دکھائی۔ "یہ

تمہارے ماموں کا فوٹو ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"پڑھ کر بتاؤ کیا لکھا ہے؟"

"ماموں میاں نے یہاں ایک جلسے میں تقریر کی تھی اس کا ذکر ہے۔"

"تم ان سے بہت ڈرتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اور ممانی...... وہ نرم مزاج ہیں؟"

"ممانی...... وہ تو اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔"

"سکول میں؟"

"جی ہاں۔ مولوی صاحب کا۔ جج کرامت حسین کا مدرسہ۔ وہ ہمارے نانا کے دوست تھے...... ابھی ماموں سے ان کا بیاہ کہاں ہوا ہے۔ بس منگنی ہوئی ہے۔ آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہیں۔"

"اور تم......؟"

"ہم ساتویں میں......" ذرا جھجھکے۔

یک لخت گلنار اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی اور چق کی اوٹ سے امین آباد کی رونق دیکھنے میں محو ہو گئی کمرے میں محفل جمی رہی۔ گلزار بائی کو عرصہ دراز کے بعد ایک ٹوٹے پھوٹے FAN میسر آئے تھے۔ انہوں نے مرزا گڑگڑی سے دریافت کیا "مرزا صاحب اور خدمت کروں......؟ نل ودمن کی ایک اور غزل سنئے گا......؟" سازندوں نے فوراً اپنی اپنی جگہ سنبھالی۔ گلزار بائی نے بڑی دل دوز آواز میں شروع کیا۔

ڈھونڈا اسے کہاں کہاں اس کا کہیں پتہ نہیں
آئے گئے یہاں وہاں ہائے وہ گل ملا نہیں

گلنار کی جھلک دیکھ کر ہوٹل کے نیچے بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ وہ بے دماغ ہو کر کمرے میں واپس آئی۔

ڈھونڈا اسے کہاں کہاں اس کا کہیں پتہ نہیں

اختر آفندی بیڑیاں پھونکتے رہے۔ میر حقہ نے جیب سے زنجیر والی گول گھڑی نکال کر دیکھی اور لڑکوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ گلنار قد آدم آئینے کے سامنے جا کر بال سنوارنے لگی پھر سٹول پر بیٹھ گئی اور اپنی شکل غور سے دیکھتی رہی...... یہودی کی لڑکی...... اسیر حرص، صید ہوس...... اور ابھی ایک درخشاں مستقبل سامنے موجود ہے۔

...... آئے گئے یہاں وہاں ہائے وہ گل ملا نہیں...... والدہ لہک لہک گایا کیں۔

3۔ طوطے والا بنگلہ

چاروں لڑکے مع میر و مرزا کھلے خزانے باکس میں بیٹھے اسیر حرص ملاحظہ کر رہے تھے۔ انٹرویل میں کمپنی کے ایک لفندرے سے کارکن نے آکر مرزا گڑگڑی سے کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ مرزا صاحب تردّد سے بولے۔ "تماشے کے بعد پسٹن جی ہم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں جانے کیا بات ہے۔"

"آپ کو مرزا حماقت بیگ کا پارٹ پیش کرتے ہوں گے۔" میر حقہ نے خشکی سے جواب دیا۔ ڈراپ سین کے بعد جب گلنار بائی کے چھیوں مہمانان خصوصی ہیروئن کے ڈریسنگ روم میں سوڈا لیمن اڑا رہے تھے۔ پسٹن جی بوکھلائے ہوئے داخل ہوئے شجو کو دیکھا ہاتھ جوڑے اور کہا "صاحب جی۔"

"جی......؟"

"صاحب جی!" بو نے مسکرا کر جواب دیا۔ ایک ہفتے میں بو جی خود کو بے حد MAN OF THE WORLD محسوس کرنے لگے تھے۔ شجو رہے وہی گھونچو کے گھونچو پسٹن جی نے چھوٹتے ہی فرمایا "تم نواب لوگ کا لکھنو ایک دم کنڈم سالا......"

شجو کے چہرے پر شوک کا اثر بہت نمایاں تھا مگر پسٹن جی کی تقریر جاری

رہی۔ "ادھر ہمارا نمبر ون کا بائی کو دیکھو...... دیکھو...... "انہوں نے ڈپٹ کر دہرایا۔
لڑکوں نے گھبرا کر گلنار پر نظر ڈالی جو نہایت مضمحل اور پژمردہ لگ رہی تھی۔

"انڈین شیکسپیئر کے تین مشاہور پلے کا ہیروئن...... کیا...... "پسٹن جی نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر کہا...... "اب سوچو۔ رات بھر سوچو...... دن بھر سوچو...... پھر رات بھر سوچو...... یہ نمبر ون آرٹسٹ جسے بومبے میں بائیسکوپ کا آفر مل چکا ہے، جب یہ ٹھیک سے سلیپ نہیں کر سکیں گی تو کام کیسے کریں گا؟ اکھا دن ہوٹل کے نیچے موالی لوگ بوم مارتا کیا۔ "انہوں نے پھر منہ اٹھا کر گردن کو جھٹکا دیا۔

"تو برلنگٹن تشریف لے جائیے۔" میر حقہ نے نرمی سے کہا۔
"اور دوسرا کھبر سنو...... "پسٹن جی نے مزید فرمایا۔ "بائی کے برابر والے روم میں انفلوئنزا کا کیس ہو گیا۔"
"اوہو...... یہ تو خطرناک بات ہے۔" مرزا گڑگڑی بولے "فوراً ان کو برلنگٹن پہنچا دیجئے۔"
"پھر ایک اور ہوٹل...... گلنار نے آزردگی سے کہا "میں ہوٹلوں میں رہتے رہتے تنگ آچکی ہوں۔ کیا ہفتہ دس دن کے لیے ایک کوٹھی کا انتظام نہیں ہو سکتا؟"

"تم ہائی کلاس لوگ ہمارا ہلپ کرونا...... پسٹن جی بولے۔ "ایک آدھ بنگلو ہی بھاڑے پر مل جائے تو کوئی حرکت نہیں۔"
مرزا گڑگڑی نے سوچتے ہوئے اپنی زبردست قزلباش مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے "لڑائی ختم ہو گئی ہے گورے افسر اور صاحب لوگ لکھنو واپس آرہے ہیں اس وجہ سے کوٹھیاں آج کل ذرا مشکل سے ملتی ہیں۔"
"ہمارے کو بھی سب ایسا ہی بولا۔ تبھی ہم نے آپ لوگ کو ادھر بلایا۔"

"ہم کل شام تک دو چار لوگوں سے معلوم کر کے آپ کو کہلوا دیں گے۔ آپ بھی تلاش جاری رکھیے۔" مرزا گڑگڑی نے جواب دیا۔

فجو بو للو ننھے حسب سابق ایک قطار میں صوفے پر متمکن تھے۔ سامنے کی دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر فجو کی نظر پڑی۔

OCTOBER 14, 1919

ذہن میں ایک خیال کوندا...... طوطے والا بنگلہ۔ آج چودہ تاریخ ہے۔ ماموں میاں دلی سے لوٹیں گے 26 کو۔ ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ تینوں بھی سر کھجاتے ہوئے شاید یہی سوچ رہے تھے۔

"تسلیم نواب صاحب۔" گلزار بائی نے کمرے میں آکر کہا۔

"آداب......" فجو نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ "ہم نواب صاحب نہیں ہیں۔"

"آئے...... ہائے...... پھر کیا ہو؟"

"ہمارے ہاں کے تعلقدار نواب نہیں کہلاتے...... بو کو پھر وضاحت کرنا پڑی۔ "اور کیا کہلاتے ہیں......؟"

"بس تعلق دار...... یا راجہ...... ٹھاکر......"

"بہت اچھا بندگی راجہ صاحب...... گلزار بائی نے کہا۔

جب سولہ سالہ راجہ صاحب کریم پور مع احباب ڈریسنگ روم سے نکل کر بگھی کی طرف جا رہے تھے۔ بو نے ان کے کان میں پھونکا "اماں وہ تمہارا طوطے والا بنگلہ...... کرائے پر اٹھتا ہے کہ نہیں......؟"

"اٹھتا تو ہے......"

"ابھی چار مہینے وہ کرنٹی ڈاکٹرنی اس میں رہ کر گئی ہے کہ نہیں۔"

"تیس روپیہ مہینہ کرایہ دیتی تھی۔" لالہ گھنشام داس رستوگی عرف للو جی نے پروفیشنل انداز میں کہا۔ "ہم ایک ہفتہ کا بیس روپیہ طے کروائے لیتے ہیں۔ بلکہ پچیس سے شروع کریں گے۔ گلنار بائی وہاں آ جائیں بس روز جا کر گانا سنا

کریں گے۔" للوجی سنگیت کے رسیا تھے۔

"اور ان کی گالی گلوچ اور کوسنے کون سنے گا؟...... بنگلے کو بھٹیار خانہ بنا دیں گی۔" شجو نے ڈھلمل یقین ہو کر کہا "اور سب سے بڑی بات یہ کہ ماموں میاں کو واپس آکر پتہ چل گیا تو ہماری بخیہ نہیں ادھیڑ دیں گے۔"

"انہیں پتا کیسے چلے گا۔ سب معاملات خفیہ......" للوجی نے گنجینہ سراغ رسانی کے ابواب یاد کرنے شروع کیے۔

میر و مرزا کو پیچھے پیچھے آتا دیکھ کر وہ سب خاموش ہو گئے۔

صبح سکول جانے سے پہلے شجو دفتر کے کمرے میں گئے جہاں میر حقہ ایک سل پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھے۔ شجو نے فوراً جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔

"میر صاحب......!"

"ہاں بھیا۔"

"یہ گلنار بائی کتنی اچھی ہیں بے چاری۔"

میر صاحب نے عینک ماتھے پر سرکا کر ان کو دیکھا اور بولے...... "بھیا بس آپ کا شوق کافی سے زیادہ پورا ہو گیا۔ دو تماشے دیکھ آئے۔ ان سب لوگوں سے مل لیے۔ اب جائیے اپنی پڑھائی شروع کیجئے۔ اسکول جائیے۔ آپ دو سال سے ساتویں کلاس میں فیل ہو رہے ہیں۔"

یہی راجہ شجاعت حسین کی دکھتی رگ تھی۔ فوراً آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چند لمحوں بعد دل کڑا کر کے مدعا بیان کر ہی دیا۔ "میر صاحب...... گلنار بائی کو بنگلہ میں بلا لیں......"

میر حقہ چونک اٹھے "بھیا کیوں اپنی شامت کو پکارتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ یہ نہایت نازیبا بات ہے۔ میاں کو جب معلوم ہو گا......

"میاں...... میاں...... میاں نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔" شجو نے یک لخت چلّا کر کہا۔

"خاموش......" میر حقہ نے گرج کر ڈانٹا۔ فجو بھیا روتے' آنسو بہاتے تیر کی طرح سیدھے ماں کے کمرے میں پہنچے۔ وہ تخت پر بیٹھی کچھ کتر بیونت میں مصروف تھیں جاکر ان کی گود میں سر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگے۔ ماں اکلوتے یتیم نور نظر کو اس طرح روتا دیکھ کر بیتاب ہو گئیں۔ دہل کر بولیں

"چاند...... میرے لال...... بھیا...... کیا ہوا...... خیریت......؟"

فجو اور روئے' جب چند منٹ بعد جی ہلکا ہوا۔ ماں کے دوپٹے سے آنسو خشک کر کے ساری داستان سنائی۔

والدہ خود رونے لگیں۔ پھر ناک سنک کر بولیں۔ "آج تمہارے ابا زندہ ہوتے یا نانا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ تمہاری اتنی سی فرمائش پوری نہ ہوتی۔"

ماں کی یہ حمایت دیکھ کر راجہ صاحب فوراً شیر ہو گئے۔ "امی جان! میر صاحب کو بلا لاؤں؟"

"بلاؤ......"

میر حقہ کھنکار کر کمرے میں داخل ہوئے مغلس (فروتن میر صاحب) شاہان صفویہ کے خاندان سے تھے۔ ان کا پاس ادب تھا اور عمر میں بہت بڑے تھے ورنہ کوئی اور اہلکار ہوتا رانی صاحب کریم پور اس کی طبیعت صاف کر دیتیں۔

وہی مقدمہ دوبارہ پیش کیا گیا۔ رانی صاحب جو میکے میں بڑی بٹیا کہلاتی تھیں' سب سن کر بولیں "میر صاحب ہماری طرف سے اجازت ہے میاں کو ہم سمجھالیں گے۔"

میر حقہ نے تعجب سے ان کو دیکھا مامتا ایسا اندھا اور اوندھا جذبہ ہے' جس کی حد نہیں۔ میر صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کمرے سے باہر آئے۔ فتح مند و سرخ رو فجو بھیا نے پیچھے پیچھے آکر پوچھا"ہم پسٹن جی کو کہلوادیں؟"

میر حقہ برآمدے کے ایک ستون سے ٹک کر بولے "بھیا ذرا یہ تو سوچئے۔ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بیرسٹر صاحب تھیٹر بازی کے شدید مخالف ہیں، تو وہ لوگ ادبداکر انہی کے مکان میں کیوں آکے رہیں گی؟"

"ان کو یہ تھوڑا ہی بتائیں گے کہ بنگلہ ہمارا ہے کہہ دیجئے ہمارے پڑوس میں ایک کاٹیج خالی ہے۔ان کو پتہ ہی نہ چلے گا۔اس کا سب انتظام ہم اور للو کر لیں گے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

میر حقہ نے نظریں اٹھا کر تاسف سے صاحبزادے کی شکل دیکھی۔ جاسوسی ناول...... تھیٹر...... بڑے ہوں گے تو عیاشی......

دوسرے روز مس گلنار، گلزار بائی، منوا اور کندن مہری کا طائفہ مع سازوسامان دو تانگوں پر سوار بیرسٹر رفاقت حسین کی کوٹھی واقع کلائیڈ روڈ کے عقبی پھاٹک میں داخل ہوا۔ وسیع احاطے کے ایک سرے پر پھونس کی وہ بنگلیہ کھڑی تھی، جو کبھی کبھار کرائے پر اٹھا دی جاتی تھی ورنہ گیسٹ ہاؤس کا کام دیتی تھی۔ بنگلے کے صدر دروازے میں تالا پڑا تھا۔ گلنار باہر لان پر کھڑی خوشی سے باغ کا نظارہ کرتی رہی کیسی پر فضا جگہ تھی۔ شجو اور للو کا سکھایا پڑھایا مالی نمودار ہوا۔ دروازے کا تالا کھولا اور بندگی کر کے غائب ہو گیا وہ سب اندر گئے۔ منوا نے گول کمرے کی کھڑکیاں کھولیں۔ ہوا کا ایسا فرحت بخش جھونکا اندر آیا گویا جنت کی کھڑکی کھل گئی۔ پسٹن جی نے صبح شام کھانا بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اپنی مالکنوں کی خانہ بدوشی کی عادی کندن نے اسٹو جلا کر چائے کا پانی رکھا...... گلنار کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔ بنگلے کے پچھواڑے پپیتے اور سیتا پھل کے پیڑ لگے تھے۔ اس کے بعد ایک جافری پر مورننگ گلوری کی گھنی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ جافری کے سرے پر بانس کا چھوٹا سا پھاٹک دوسری طرف بہت بڑی سفید رنگ کی کوٹھی۔ مرزا گڑگڑی نے بتلایا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پڑوس ہی میں ہے وہی ہو گی۔ وہ بید کے صوفے پر آ بیٹھی۔ کندن نے گلاس میں "کڑک" چائے پیش کی۔ آپا دوسرے کمرے میں چیزیں منگوا رہی تھیں۔

گلاس بہت گرم تھا۔ اسے نزدیک کے بک شیلف پر رکھ کر گلنار کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ منصور موہنا۔ روز الیمرٹ حصہ اول و دوم۔ کلجگ کی کھونٹی عرف بازیچہ اطفال مترجمہ دوارکا پرشاد افق۔ قصہ عمر عیار......اس کتاب کے

سرورق پر بچکانی رائٹنگ میں لکھا تھا۔

سید شجاعت حسین جماعت پنجم۔ کالون تعلقدارز اسکول لکھنو۔ گلنار چونک اٹھی اچھا یہ بات ہے۔ مزید تجسس سے اس نے دوسری کتاب نکالی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھی۔ بھورے رنگ کے لاسوسائٹی جرنل میں سے ایک پوسٹ کارڈ نیچے گرا...... پتا اردو میں تھا کسی موکل کا خط تھا۔ عالی جناب سید رفاقت حسین صاحب بیرسٹر کو ملے......

گلنار کا سر چکرا گیا۔ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ وہاں دیوار پر وہی تصویر آویزاں تھی جو پرسوں نرسوں پانیر اخبار میں دیکھی تھی۔

اب کیا کروں اس گاؤدی چھنکو راجہ نے غضب کیا...... کیوں...... بیچارے نے اپنی طرف سے بھلائی ہی کی......اب واپس کہاں جاؤں...... شہر میں انفلوئنزا کی وبا پھیلتی جارہی تھی۔ اول تو ہوٹل تھے ہی نہیں' جو اکادکا تھے وہ مخدوش۔ خیر پسٹن جی خود کوچ کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چند روز کی بات اور ہے۔ ہرچہ بادا باد۔ بہرحال وہ خردماغ مولوی بیرسٹر 26 تاریخ کو لوٹے گا اس سے پہلے روانہ۔ اس بھولے بچے شجو نے کم از کم چند روز کے لیے ایک آرام دہ پرسکون ٹھکانے کا بندوبست کر دیا۔ اس نے بیڈروم میں جاکر ماں کو بتایا۔

"ہوں......" وہ کھل اٹھیں۔ "لالے مہاراجہ ہمیں چھل کر کے۔" کمر پر ہاتھ رکھ کر گنگنانے لگیں' والدہ محترمہ کے اس قدر شدید بازاری پن سے بعض اوقات گلنار کی جان جل کر رہ جاتی تھی۔ پھر اسے خیال آتا تھا کہ وہ خود بھی گاہے بگاہے اسی قسم کی سستی حرکتیں کرتی ہے اور الجھ کر چپ رہتی تھی۔ والدہ نے فرمایا "گھبرائیے کیوں ہے گلو اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

میں تو جب سے اس چھنکی راجہ سے ملاقات ہوئی ہے یہی سوچ رہی ہوں کہ نیک شگون ہے۔ پنا کا قصہ بھول گئی۔ اسی طرح نواب نے جاکر اپنے باغ میں اتارا تھا۔ تیرے ہی ماموں کی لڑکی ہے کوئی آسمان سے نہیں اتری۔ نہ سرخاب کے پر لگے ہیں...... لو جی...... مہینے کے اندر اندر رئیس نے نکاح کر لیا۔

ریاست کی چھوٹی بیگم بن بیٹھی۔ نواب الماس محل صاحبہ خطاب ملا ہے۔"

گلنار کو ہنسی آگئی۔ "آپا بے چارہ شجو بچہ تو مجھ سے نکاح کرنے سے رہا۔"

"اے شجو نہ سہی، کوئی اور رئیس سہی اور نکاح کا ذکر کیا ہے...... ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ یہ بہت پیسے والی تگڑی پالٹی ہے۔ اودھ کے نواب لوگ ہیں مذاق نہیں...... ہماری طرف کے اجڈ دیہاتی زمیندار نا ہیں۔ ذرا بنگلہ تو دیکھو کیسا سجا رکھا ہے۔ وہ تو جب مالی قفل کھول کر چپ چاپ لوٹ گیا جبھی میں تاڑ گئی کچھ دال میں کالا ہے۔"

والدہ جس قدر کھاتی تھیں اسی قدر لگا تار بے تکان بولتی تھیں۔ گلنار تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں بھی سب سامان قرینے کا۔ پیتل کی گنگام میں باغ کے کنویں سے نکلا تازہ تازہ پانی۔ کونے میں اینٹوں پر دھرا احمام۔ اس کے نیچے بڑا قلعی دار لوٹا۔ سفید میز پر پھولدار چینی کا جگ، مگا اور چلمچی، نیلے کنارے والا سفید تام لوٹ۔

وہ غسل خانے میں دیر تک نہاتی رہی اور کاہلی سے چڑیوں کی چہکار سنا کی۔ پھر بال سکھانے کی خاطر سبزے پر نکل گئی۔ ہردئی مالن گھاس کھودتے کھودتے حیرت سے اسے تکنے لگی۔ اتنی سندر نوٹنکی والی۔

امرود سے لدے درختوں پر طوطے بیٹھے تھے اور جافری پر پھیلی مورننگ گلوری کی بیل میں تیز نیلے بگل نما سینکڑوں پھول ہوئے تھے۔ جافری کے ادھر کوٹھی کی جھلک نظر آئی۔ سفید، میلے میلے غرارے پہنے مامائیں ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ مرغیاں چرتی چگتی پھر رہی تھیں۔ دور سے بھینسیں ڈکرانے کی آواز آرہی تھی، کس قدر پر سکون، محفوظ اور مامون جگہ تھی۔

بال سکھا کر ٹہلتی ہوئی وہ بنگلے میں واپس آئی اور کمرے کمرے پھرنے لگی۔ گلابی اور سبز پھولدار ٹائلوں سے مزین سنگھار میزیں، جھال پال، قلعہ نما سائیڈ بورڈ، بارہ سنگھے کے سینگوں والا فرنیچر؛ سیاہ و سفید ٹائلوں پر کشمیری نمدے۔ دیواروں پر انگلستان کی سینری کی رنگین تصویریں جو ولایتی رسالوں سے

تراش کر فریم کی گئی تھیں۔ وہ پھر کھڑکی میں جا بیٹھی اور سوچا۔ جب مہمان خانہ اتنا آرام دہ ہے تو گھر کیسا نہ ہوگا۔ پیدائش کے بعد سے ماں کے ساتھ اور پھر خود ہندوستان اور برما کے دوروں پر سرایوں، خیموں اور ہوٹلوں میں زندگی گزاری تھی۔ بڑی آرزو اور رشک کے ساتھ آنکھیں بند کیں اور تصور کرنے لگی۔ اس سفید کوٹھی کے کمرے اندر سے کیسے ہوں گے۔ اس میں کیسی پردہ نشینیں رہتی ہوں گی۔ محفوظ دماموں اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔

شجو کی والدہ رانی صاحبہ کریم پور اپنے کمرے میں تخت پر بیٹھی چھوٹے بھائی کی بری کے لیے اودے فرشی پاجامے کی گوٹ پر ماہی پشت کا جال بنانے میں مصروف تھیں۔ سارے گھر میں شادی کے انتظام کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ رشتے دار بیویاں اور باندیاں بے طرح مصروف تھیں۔ صبح سے ایک نئی دلچسپی یہ پیدا ہوئی تھی کہ طوطے والے بنگلے میں تھیٹر والیاں آکر اتری تھیں اور وہ بھی خفیہ۔ اس "خفیہ معاملے" میں سب گلے گلے پانی شجو میاں کے ساتھ تھے کیوں کہ سب بیرسٹر صاحب کی خشک مزاجی سے شاکی تھے اور اب ذرا تفریح کا موقع ملا تھا۔ خود بڑی بٹیا...... شجو کی والدہ...... ایک بار پچھلے برآمدے سے جاکر جھانک آئیں جہاں سے طوطے والا بنگلہ نظر آتا تھا۔ باپ، اللہ جنت نصیب کرے اور مرحوم شوہر کے زمانے میں اسی طوطے والے بنگلے میں آئے دن راگ رنگ کی محفلیں جما کرتی تھیں...... مشاعرے، قوالیاں، ننوا، بچوا اور جانکی بائی یہاں آکر اتر چکی تھیں۔ کون انوکھی بات تھی بے چارہ یتیم بچہ جس کی صورت دیکھ کر جیتی تھیں، اور جو ماموں کے سامنے سہا سہا رہتا تھا، اس کی اتنی سی خوشی پوری ہو گئی کون غضب ہوا لیکن صبح سویرے ہی میر حقہ کو حکم دے چکی تھیں کہ بھیا وقت بے وقت بنگلے کی طرف نہ جانے پاویں جب جاویں آپ ساتھ جائیے۔ اب وہ اطمینان سے بیرسٹر صاحب کی بری کے جوڑوں کی تیاری میں منہمک تھیں۔

کندن کٹنی، وہ فخر پیشہ دلالاں، سہ پہر تک شاگرد پیشے کی اصلیوں میں رل مل کر ساری ٹوہ لے آئی۔ لہنگا گھماتی بنگلہ پر واپس پہنچی۔ گلنار جھپکی لے کر

اٹھی تھی۔ گلزار فرش پر بیٹھی آئینہ سامنے رکھے اپنے جھاڑ فانوس بال سنوار رہی تھیں۔

"کہاں مر گئی تھی حرافہ چائے بنا۔" گلنار نے جمائی لے کر کہا۔

"ہو آئی اپنے یاروں میں؟" گلزار بائی نے دریافت فرمایا۔

کندن نے اسٹو سلگاتے ہوئے ساری الف لیلہ سنا دی۔ میاں یعنی بیرسٹر رفاقت حسین کی زمینداری ضلع بارہ بنکی میں ہے۔ ادھر بڑے سرکار نے ان کو پڑھنے بھیجا بلایت اور ادھر وہ خود اور ان کے داماد شجو کے باپ...... پلیگ میں چٹ پٹ...... شجو دس سال کے تھے۔ ان کا علاقہ کورٹ آف وارڈ نے لے لیا انتظام کی خاطر...... میاں بلایت سے لوٹے تو کنبے کی ساری ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ وہ بھی ماں باپ کے اکلوتے لڑکے۔ ماں زندہ ہیں۔ یہیں کوٹھی میں رہتی ہیں اور ایک بڑی بہن...... شجو کی والدہ۔ انہیں ان کے علاقے کریم پور سے اپنے پاس بلوا لیا۔ لڑکے کو سکول میں داخل کرا باپ اور بہنوئی نے خوب رنگ رلیاں منائی تھیں۔ بہت دولت اڑائی۔ ان میاں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ کھیل تماشے 'ناچ گانے سے للہی۔ بس شام کو کلب جا کر گیند بلا کھیل آتے ہیں۔ عید کے چاند بیاہ ہو گا۔ منگیتر خالہ کی لڑکی ہے۔ اس کا قصہ بھی معلوم کر آئی۔ بلایت جاتے وقت خالہ خالو سے کہہ گئے تھے۔ میرے پیچھے لڑکی کو انگریزی نہ پڑھائی تو لندن سے میم کر لاؤں گا۔ اس ڈر سے ان لوگوں نے لڑکی کو سکول میں ڈال دیا۔ بیرسٹر دبنگ آدمی ہیں......"

"خیر......" گلزار بائی نے چوٹی کرتے ہوئے ہونٹ پچکا کر کہا" ان میاں جی کا تماشہ بھی ہم دیکھیں گے۔" اور گلنار پر نظر ڈالی ان ماں بیٹیوں کا ذاتی اور خاندانی تجربہ یہی بتاتا تھا کہ جو مرغا جتنا پارسا ہو سمجھ لو اتنی آسانی سے ہی دام میں پھنسے گا۔ گلزار بائی اس وقت نہ جانے کیا کیا STRATEGIES بنانے میں محو تھیں 'مگر گلنار کا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر چپکے سے بید مشک پیا اور باغ میں چلی گئی۔

پھر اسے بیرسٹر صاحب کی تصویر تکے جانے کا خبط سا ہو گیا۔ جب موقع ملتا جا کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ ناممکن خواب۔

4۔ راگ دل چمن

دوسرے روز صبح شجو مرزا گڑگڑی کے ساتھ بنگلے پر پہنچے۔ سلام دعا کے بعد شجو نے کہا "ہم یہاں نزدیک ہی رہتے ہیں۔ سوچے آپ سے پوچھ آئیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

ان کی اس سادہ دلی پر گلنار کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے جواب دیا۔ "شجو میاں! وہ راز عشق در خفیہ پولیس والی کتاب آپ نے غور سے نہیں پڑھی لیکن گنجینہ سراغرسانی میں نے ڈھونڈ نکالا۔ آیئے دکھلاؤں۔ "گول کمرے میں لے جا کر اس نے کتابیں پیش کیں، جن پر مالک مکان کے نام لکھے تھے اور مالک مکان کی تصویر دکھائی۔ شجو جھینپ کر چپ ہو گئے۔ گلنار نے مرزا گڑگڑی سے کہا "ہم نے نادانستہ اوکھلی میں سر دیا۔"

"کیا کہیں بائی صاحب ان کی بال ہٹ تھی اور آپ کو مکان کی ضرورت۔" مرزا گڑگڑی ندامت سے بولے۔

طوطے والے بنگلے میں آئے اسے پانچ دن گزر گئے وہ بڑی شرافت اور خاموشی سے رہ رہی تھی۔ صبح کو ریاض کرتی جسے شجو اور للو کوٹھی کے باغ میں بیٹھ کر سنا کرتے۔ شاگرد پیشے والے بھی ادھر ادھر درختوں کے نیچے جمع ہو جاتے۔ رات کو شجو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ناٹک لکھتے۔ اسیر حرص کے مرزا حماقت بیگ، جھنجھٹ اور بی نحوست نے ان کو بہت انسپائر کیا تھا، سنیچر کی رات ہوم ورک کے بجائے (مجھے سمجھا ہے کیا ہر چرن داس؟) بہت دیر تک لیمپ کے سامنے قلم کاغذ لیے بیٹھے رہے۔ نب والا قلم نقرئی دوات میں ڈبو ڈبو کر بار بار 786 لکھا۔ دماغ پر بہت زور ڈالا پر کوئی پلاٹ سمجھ میں نہ آیا۔ اچانک کاسٹ کے نام سوجھ گئے۔ فوراً لکھنا شروع کیا۔ 786 زنانہ پارٹ ویران جہاں بیگم۔ ہونق بانو۔ بربادی خانم

بیہودہ خاتون۔ مردانہ پارٹ: احمق نواز جنگ، غبی الدولہ وحشت الزماں، خوفناک سنگھ۔ اب ان پر ایک الہامی کیفیت طاری تھی اور نام تھے کہ بارش کی پھوار کی طرح صفحہ قرطاس پر گرتے چلے جا رہے تھے۔ اپنی جودت طبع پر عش عش کرتے راجہ شجاعت حسین کچھ دیر بعد کاپی بک پر سر رکھ کر اونگھنے لگے۔

صبح دس بجے ہی ببو جی، للو جی اور ننھے کوٹھی پر آن دھمکے۔ شجو میاں اس وقت ناشتہ کر رہے تھے اور طوطے والے بنگلے سے طبلہ کھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ للو جی بے صبری سے بولے "آج شاید یہودی کی لڑکی کی ریہرسلیں ہو رہی ہیں۔ چلو دیکھ آویں۔"

"میر حقہ کو بلا لو۔" شجو نے جواب دیا۔ ناشتہ ادھورا چھوڑا اپنے ناٹک (جو ابھی کاسٹ کے ناموں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا) کی کاپی بک لینے اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ پھر میر حقہ مرزا گڑ گڑی اور تینوں دوستوں کے ہمراہ اور بڑی بٹیا کی اجازت کے ساتھ کا ٹیج کی سمت روانہ ہوئے۔

گلنار برآمدے میں کھڑی ہر دئی مالن سے اپنے لیے بار گندھوا رہی تھی۔ "آ گئی چنڈال چوکڑی۔" اس نے لڑکوں کو دیکھ کر مسرت سے کہا۔ طوطے والے بنگلے میں اس وقت غیر متوقع طور پر بڑی رونق تھی۔ اسیر حرص کے دونوں مسخرے ان کے علاوہ ماسٹر اختر آفندی، ماسٹر فیروز، عطا محمد پیٹی ماسٹر، منو، کندن مہری چائے بنا بنا کر سب کو دے رہی تھی۔ گلزار بائی ایک کونے میں بیٹھی باقر خانیاں اڑا رہی تھیں۔ جو صبح صبح منو سائیکل پر جا کر چوک سے لائے تھے۔ ماسٹر فیروز صوفے پر اکڑوں بیٹھے گجراتی رسم الخط میں چھپی "راگ دل چمن" کی ورق گردانی کر رہے تھے، جو تھیٹر کی قدیم ترین غزلوں کا مجموعہ اور ناٹک منڈلیوں کی بائبل تھا۔ ماسٹر فیروز نیو الفریڈ کمپنی کے نمبرون گویے تھے۔ صبح سے شغل مے شروع کر دیتے تھے اور مستقل گنگناتے اور طرح طرح کی دل آویز دھنیں بٹھاتے رہتے تھے۔

کوٹھی سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے

بعد گلنار نے للو جی سے پوچھا "اسیر حرص کیسا لگا؟"

"نمبر ون۔" للو جی نے انگلی اٹھا کر رستم جی پسٹن جی کے انداز میں جواب دیا۔ "اب یہودی کی لڑکی پر یکٹس کریں گی؟"

"کون...... ؟ میں؟ نہیں تو۔ تم لوگ کچھ سننا چاہتے ہو؟" گلنار نے پوچھا۔

"بیٹا! ہم تمہارے غلاموں کے غلام۔ جس کو جو حکم دو وہ خدمت کرے۔" گلزار بائی بولیں۔ آج وہ جادوگرنی یا گلابو شتابو کے بجائے اصل نسل نائیکہ لگ رہی تھیں۔

شجو نے ذرا تکلف سے گلنار کو مخاطب کیا۔ "ہمیں ایک آدھ کومک سین سنوا دیجئے۔"

گلنار نے دونوں مسخروں کو اشارہ کیا۔ پاسنگ شو کی ڈبیا جیب میں ڈال کر ان صاحب نے جو مرزا حماقت بیگ بنتے تھے' جھک کر نوعمر راجہ صاحب کو تسلیم عرض کی۔ کھنکارے اور آستین چڑھا کر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ پھر یک لخت گرج پڑے "فکر۔ فکر۔ فکر۔ فکر۔ جتنی مجھ کو ہے اتنی اگر کوئی ساہوکار کرتا تو مفلس بینک کا حصہ دار بن جاتا۔ اگر کوئی ناٹک کا منشی کرتا اس کا نیا کھیل پاس ہو جاتا۔ اگر جرنل کو پر کرتا تو ٹرانسوال کا ستیاناس ہو جاتا۔"

چاروں نوجوان مبہوت ہو کر مسخرے کو دیکھا کیے۔ کندن مہری دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھی بکری کی طرح پان چبا رہی تھی۔ دوسرا مسخرا جو اسیر حرص میں جھنجھٹ بنتا تھا' جھٹ اس سے مخاطب ہو کر گانے لگا۔ "ارے واہ جی واہ...... یہ لوٹا چماری...... ہو صورت پہ واری...... بڑھاپے کا ٹٹو۔ محبت پہ لٹو۔ ادھر ادھر زنگی جوانوں میں۔ جنگلی گھرانوں میں ہو تا شمار۔ تو ہے میری جانی۔ تو ہے نانی۔ تو ہے میری خالہ جان۔ جان لے۔ ایمان لے۔ مکان لے۔"

گلزار بائی نے قہقہہ لگایا۔ للو جی جوش سے بے حال تھے۔ میر حقہ اپنی جگہ پر کسمسائے۔

پھر ساری کمپنی نے گلزار بائی سمیت اسیر حرص کا مقبول گانا جو پچھلے تین چار دن سے لکھنو کے لونڈے گلی کوچوں میں گاتے پھر رہے تھے' شروع کیا۔
''صورت سیرت میں چندہ...... ہر فن کامل ہے بندہ۔ شکل مچھندر۔ عقل میں بندر۔ خاصے قلندر۔ واہ جی واہ۔''
للو جی بھی تال دے کر ساتھ لگ گئے۔
'ممبر بن کر گھر گھر پھر کر ٹیکس لگائے گا بندہ۔''
آہاہاواہ واہ خوب نکالا یہ دھندا۔''
یاروں میں غاروں میں جنگی چماروں میں۔ دھوبی کہاروں میں پاؤں گانام۔ کرسی پر بیٹھوں گا' یاروں میں اینٹھوں گا۔ دولت سمیٹوں گا میں صبح شام۔ خان بہادر بن کے چال چلوں گا تن کے۔''
اب سب موڈ میں آچکے تھے۔ بوجی' شجو اور مرزا گڑگڑی کورس میں شامل ہو گئے۔ صورت سیرت میں چندہ۔ ہر فن کامل ہے بندہ۔
دفعتاً گلنار نے کھڑکی کے پاس جاکر بڑے جذباتی انداز میں کہنا شروع کیا...... ''لو یار شوخ شنگ۔ چھیڑ چنگ کا سارنگ۔ جام کا جمادے رنگ۔ پھر کہاں یہ دوست ہوں گے اور کہاں یہ بزم چنگ۔ چلی ناؤ منجدھار میں۔'' پھر سب کی نظریں بچا کر چھنگلیا کی نوک آنکھ کے گوشے تک لے گئی اور آنسو پونچھا۔
ماسٹر اختر آفندی برآمدے میں جاکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ بیڑی سلگائی اور سامنے امرود کے درختوں پر اڑتے طوطوں کی بہار دیکھنے لگے۔
دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ بڑی بٹیا میر حقہ کے ذریعے گلنار کو کہلوا چکی تھیں کہ سب کے لیے خاصہ کوٹھی سے بھیجا جائے گا۔ ہیڈ خدمتگار کی قیادت میں ملازم کھانے کی کشتیاں اٹھائے آپہنچے۔ طبلہ بایاں' فرشی ہارمونیم اور فرنیچر ایک طرف کو کھسکا کر دستر خوان بچھایا گیا۔ کوٹھی کے باورچی خانے میں رنگین پیڑھی پر بیٹھی' غرارے کے پائنچے پنڈلیوں تک چڑھائے بڑی بٹیا دیگچیوں میں سے کھانا نکلوا رہی تھیں اور سفید دوپٹے سے آنسو خشک کرتی جاتی تھیں۔ اللہ رکھے یہ

پہلا موقع تھا کہ جوان بیٹے نے اصل خیر سے طوطے والے بنگلے میں محفل آرائی کی تھی۔ باپ اور شوہر بے طرح یاد آرہے تھے۔ ان کے زمانے میں اسی طرح کھانا اتروا کر بنگلہ بھجواتی تھیں۔

کھانے کے بعد سب نے ادھر ادھر آڑے ترچھے لیٹ کر قیلولہ شروع کیا۔ میر حقہ نے شجو سے کہا" بھیا اب کوٹھی چلئے۔"

بھیا نے ملتجیانہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔ میر حقہ خاموش ہوگئے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر انہوں نے بھی آنکھیں موندلیں۔

"پی اور پلا تا جا ساقی ہو خیر تیرے میخانے کی۔" کوئی پون گھنٹے بعد میر حقہ کو ماسٹر فیروز کے فلک شگاف نعرے نے نیند سے چونکا دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر سیدھے ہو بیٹھے۔ دھاگے کی عینک ناک پر دوبارہ جمائی اور سامنے غور سے دیکھا۔ سرخ فراک میں ملبوس ایک سنہرے بالوں والی لڑکی گلنار کے ساتھ بید کے صوفے پر بیٹھی بیئر پی رہی تھی۔ ماسٹر فیروز فرش پر بادہ نوشی میں مشغول تھے۔ گلزار بائی کونے میں اب تک انٹا غفیل تھیں۔ میر حقہ نے گھبرا کر شجو میاں کو پکارا اور اطمینان کی سانس لی۔ شجو ببو للو ننھے چاروں دوسرے کمرے میں "مرزا حماقت بیگ" سے باتیں کر رہے تھے۔ میر حقہ نے مرزا گز گزی کو اشارے سے پاس بلایا اور چپکے سے دریافت کیا" یہ مسیا کون ہے؟"

"آپ پہچانے نہیں؟ کمپنی کی نمبر ٹو ایکٹریس ڈھیلا بائی۔"

"چہ خوب۔ نیلی آنکھیں۔ پیلے بال۔ نام ہے ڈھیلا۔ ڈھیلی چال۔ آیا نیا وبال۔" میر حقہ نے فوراً تک بندی کی۔ "یہ کب آئی؟"

"ابھی جب آپ سنا رہے تھے۔" مرزا گز گزی نے جواب دیا۔ "اس کی ماں کلکتہ کی طوائف ہے باپ کوئی گورا سولجر تھا۔ سنا ہے ماسٹر فیروز اس پر زہر کھاتے ہیں مگر گلنار کی طرح ان کا دماغ بھی ساتویں آسمان پر ہے۔"

گلنار اور ڈھیلا بائی پاؤں ہلا ہلا کر "سہیلیوں کا گیت" الاپ رہی تھیں۔

"جھولنے والی ہے رشک گل لالہ جھولا۔ جا کے بلبل تو رگ گل کا بنالا جھولا۔"

فیروز نے گا کر جواب دیا" دیکھ اے پیاری فصل بہاری نہریں ہیں جاری پھول ہے کیاری۔ ادھر ادھر یوں چلت سنانا آہاہا۔"

ڈھیلا بائی ناک بھوں چڑھا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ موتیوں کے بٹوے سے قینچی سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک خود لیا دوسرا گلنار کو دیا۔ چند کش لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا تانگہ باہر موجود تھا' کسی کو سلام نہ دعا۔ رواں۔۔

"بہت خوب۔ نام چاہے ڈھیلا بائی ہو مگر گوری چمڑی کا رعب یہ بھی جماتی ہیں۔" میر حقہ نے مرزا صاحب سے کہا۔

کھانے کے بعد ماسٹر اختر آفندی پھر باہر جا بیٹھے تھے اور مستقل مزاجی سے طوطوں کی بہار دیکھ رہے تھے۔ دل شکستہ ماسٹر فیروز نے پیٹی ماسٹر کے پاس جا کر زور سے کہا" سالی" اور چپ ہو گئے۔

للو نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ "کچھ سنایئے" واقعہ یہ تھا فیروز صاحب ماہر فن گلوکار تھے۔ چونک کر بولے۔ "کیا سنایئے ہم سالا۔ ہمار الک ڈاؤن ہو گیا۔ اسٹار گردش میں ہے۔" انہوں نے انگلی گھما کر گردش کی تشریح کی۔ بوتل اٹھائی اور جھوم کر بولے "ہم کیا سنائے گا سالا۔ نرگس کے اشارے ہوتے ہیں پھولوں کا رنگ بدلتا ہے۔ غنچے کی صراحی ڈھلتی ہے لالہ کا پیالہ چلتا ہے۔ سب رند ہیں مست الست بنے۔ مے دست بدست اڑاتے ہیں سب رنگ ترنگ امنگ میں ہو ہر ڈھنگ کے رنگ جماتے ہیں۔ ہاں کاگ اڑے بے لاگ اڑے۔ کچھ راگ اڑے کیا گانا ہو...... ؟ کچھ دھرپت سرپت ٹپا ٹپی یا توم تنادر تانا ہو۔"

"کچھ دھرپت سرپت ٹپا ٹپی یا توم تنادر تانا ہو۔" گلزار بائی نے نیند سے چونک کر دہرایا اور پھر سو گئیں۔ چند منٹ بعد اٹھ بیٹھیں۔ آنکھیں مل کر حاضرین محفل کو غور سے دیکھا۔ یاد آیا کہاں ہیں' بولیں "جیسے خوشبو سے بیلا' لوگوں سے میلا' مجرم سے گھات' چاند سے رات کی بہار ہے۔"

"واہ واہ سبحان اللہ۔" مرزا گڑ گڑی نے فوراً تعریف کی۔

اب گلنار ترنگ میں آچکی تھی اور گنگنا رہی تھی۔ لب جو ہو فرش آب

ہو شب ماہ ہو بادہ ناب ہو گلزار بائی کو شاید اپنی سگرونائیوں کے میدان جنگ کا خیال آیا۔ کان پر ہاتھ رکھ کر چلائیں۔ گو بھی کا توقلعہ بنایا۔ گاجر کا در واجہ۔ شکر قند کی توپ بنائی لڑے فرنگی راجہ ارے ترکاری لے لو۔ مالن آئی بیکانیر سے۔

فیروز نے ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ دھاڑ کر لڑکوں سے پوچھا۔ ''باوالوگ بولو کیا سنیں گا۔ وہی سنائیں گا۔''

''ہمیں کومک گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' شجو نے فرمائش کی۔

''ہریش چندر کا گائن چلے گا؟''

''جی؟''

''جی ہاں' جی ہاں۔ ضرور چلے گا۔'' ببو فوراً بولے۔

فیروز نے شروع کیا۔ ''من میل مٹے۔ تج بڑے۔'' سازندوں نے فوراً ایک انگریزی دھن چھیڑی۔ مسٹر بہرام فیروز جوش و خروش سے گاتے رہے۔ ''من میل مٹے تج بڑھے دے رنگ بھنگ کا گھوٹا۔ سو روگ ٹلے۔ سو سوگ جلے۔ اٹھ بھور نہا کے گنگ چڑھا کے بھنگ۔ جما لے ایک۔ نرالے ڈھنگ دکھا دے۔ ہر بار بول بم بھولا۔'' ''بم بھولا'' چلاتے ہوئے فیروز اچک کر میز پر چڑھ گئے اور ٹیپ ڈانس کرنے لگے۔ پھر وہیں سے فرمایا ''اب مرید شک ناٹک کا دادرا سناتا ہوں۔ توا کٹورہ بیچ ڈال۔ دھر لوٹے پہ دھیان۔ سویرے پھر چھنے گی۔''

''ونس مور'' للو جی للکارے۔

''سویرے پھر چھنے گی۔''

اب ماسٹر فیروز نے ''مرزا حماقت'' کا مقبول گانا شروع کیا۔ ''میری جانی شراب۔ ارغوانی شراب۔ آ جا تجھے ڈالوں پیٹ میں۔ جی میرا آیا تری لپیٹ میں۔ کوفتے پسندے منگا کر پلیٹ میں تجھ کو پیوں سلیٹ میں۔ یارو خطا معاف کرو میں نشے میں۔ یوں کہتے ہیں مرزا حماقت بیگ۔ چوکو نہ یارو انسلیٹ میں۔'' پھر جفا کیش ڈھیلا بائی یاد آ گئی۔ (بولے ''تیرے ہجر میں یار مر گئے سسرے سالے۔ آخر یہ کیا ہے گڑبڑ گھوٹالہ۔ تو عورت ہے یا عاشقوں کی ستیاناسی کا مسالہ۔'' اور

لڑکھڑا کر میز سے نیچے آرہے۔ میر حقہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ چیں بہ جبیں ہو کر گلنار سے کہا "انہیں یہاں سے فوراً چلتا کیجئے۔"

منو دوڑے دوڑے باہر گئے۔ سڑک پر سے خالی تانگہ پکڑ لائے۔ بیچارے ماسٹر بہرام فیروز کو پچھلی سیٹ پر لاد کر ان کے ہوٹل لے گئے۔ میر حقہ نے شجو سے کہا "اب آپ بھی گھر چلئے۔"

"میر صاحب! ہم ایک ناٹک لکھ رہے ہیں اس کی کاسٹ گلنار بائی کو سنا دیں......؟ بس پانچ منٹ......" شجو نے التجا کی۔

"اچھا سنا دیجئے۔"

شجو نے کاپی بک اٹھائی اور گلنار سے کہا "ہم ایک ناٹک......"

"ہاں ہاں سناؤ میاں" گلزار ہمت افزائی کے لہجے میں بولی۔

شجو نے ذرا شرما کر پڑھنا شروع کیا...... "زنانہ پارٹ۔ ویران جہاں بیگم' ہونق بانو' بربادی خانم' بیہودہ خاتون۔"

"بے حجاب بائی مہ لقا اور شامل کر لیجئے۔" میر حقہ نے ترشی سے کہا۔

شجو کے اوپر سے گزر گئی۔ سنانے میں محو رہے۔ "احمق نواز جنگ' غنی الدولہ' خوفناک سنگھ۔"

"لالہ بے حساب رائے اور بھر کس نکال سنگھ کا بھی اضافہ کر لیجئے۔" میر حقہ بولے۔ سامعین نے شجو کو زور شور سے داد دی۔ گلزار بائی نے بلائیں لیں۔

ببو دروازے کے پاس فرش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔ معاً ان کی نگاہ باہر پڑی اور رنگ سفید پڑ گیا۔ جھک کر شجو سے کہا "اب ہم سب کا بھر کس ابھی نکالا جاتا ہے۔ آپ کے ماما تشریف لے آئے۔ 26 تاریخ کو آنے والے تھے پانچ دن پہلے ہی چلے آرہے ہیں۔"

باہر سرخ بجری پر بوٹوں کی چاپ۔ چق اٹھی۔ سید رفاقت حسین بیرسٹر ایٹ لا دروازے میں موجود۔ مع گلنار و گلزار ساری کمپنی سروقد کھڑی ہوئی۔ سب نے جھک جھک کر آداب عرض کیا۔ بیرسٹر صاحب نے سر خم کر کے سب کے

سلام کا جواب دیا۔ بھانجے کو دیکھا جو نظریں جھکائے میر حقہ کی پناہ اور آڑ میں ہو گئے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے گلنار پر نظر ڈالی۔ دوبارہ محفل کا جائزہ لیا۔ ایک کرسی پر ٹک گئے۔ گلنار سے کہا" تشریف رکھئے۔ آپ کی کمپنی آج کل شہر میں بڑے اچھے کھیل دکھا رہی ہے۔ ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔"

گلنار نے تسلیم عرض کی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ اس طرح دار نووارد کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اپنی تصویر سے زیادہ صورت دار اور مدمغ مجسم تکبر و نخوت۔ خیر ٹھیک ہے جتنا بھی غرور نہ کریں کم ہے۔ اللہ نے انہیں کیا نہیں دیا۔ شرافت' دولت' عزت' وجاہت اور ہم کون ہیں؟ خدائی خوار' اٹھائی گیرے' کنجر' اس نے خود ہی خود سر ہلایا اور اپنی اور ان کی دنیاؤں کے تفاوت پر متحیر ٹکٹکی باندھے ان کی شکل تکتی رہی بیرسٹر صاحب نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔ گلزار سے پوچھا" آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔"

"جی نہیں۔ آپ کی عنایت ہے۔"

گلزار بائی باچھیں کھلائے ہمہ تن توجہ بیٹھی تھیں لیکن بیرسٹر صاحب گلنار کے بجائے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے للو جی کے ہاتھ میں کاپیاں دیکھ کر پوچھا" یہ کیا ہے؟" اور دونوں کاپیاں ان سے لے لیں۔

للو جی کی کاپی کے اوپر انگریزی میں مرقوم تھا۔ لالہ گھنشام داس رستوگی۔ جماعت دہم امیر الدولہ ہائی سکول لکھنو۔ یوپی۔ انڈیا۔ برٹش ایمپائر ورلڈ ناردرن ہمسفیر اندر اردو میں لکھا تھا۔

1۔ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ تماشا ہامان۔

اجی صاحب نتیجہ مل جائے گا

ماگارے گانی دھاپاپاگا

2۔ تماشا جوہر شمشیر عرف قتل بے نظیر

ہوا حاصل وصال دلے جی ہے نڈھال نیا دل کو ملال کروں کیا میں بیاں وہ ہے نازک دماغ کہیں دیوے نہ داغ ہووے ٹھنڈا چراغ میرے دل کا یہاں کبھی

ہو کر بیزاریاں سے ہووے فرار۔ میری مٹی ہو خوار اسے پاؤں کہاں۔

3۔ کرزن تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی۔ تماشہ دلفروش

تمہیں دوں گاواکی کھمریا جان

گارے گاماپادھاپاپا

4۔ الیگزینڈر تھیٹریکل کمپنی آف دہلی۔ تماشہ "چوں چوں کا مربہ"

(بطرز "میں باورچی کی بچی")

میں تو پھر نخرے آئی کرتی چھل اور ٹھٹھا

سارے گارے ساگامارے

5۔ تماشا لیلیٰ عرف ستارہ منگر یلیا

ے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش

کوئی مخل نہ ہو وہاں باعث حجاب کا

6۔ غزل داغ نمبر 44

بتان ماہوش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں

7۔ تماشہ فسانہ عجائب عرف خورشید زرنگار

(طرز انگریزی)

دھوئیں کی گاڑی اڑائے لیے جائے۔ پیسے کالو بھی فرنگیارے بابو ذات نہیں دیکھے جمات نہیں دیکھے۔ ایک دم ہی سب کو بٹھائے لیے جائے۔ ہندو مسلمان، بھنگی چمار سے ٹکٹ کے پیسے کٹائے لیے جائے۔

8۔ زبان انگریزی دھن دیس، تال کہروا، دوگن، اگین، اگین، وین آئی واز سنگل مائی پاکٹ واز ڈنگل۔

9۔ امروز دیگرم بفراق تو شام شد۔

(دھن بہاگ)

بیرسٹر صاحب کا سر گھوم گیا۔ انہوں نے کاپی بک بند کی۔ بھانجے کی کتاب کھولی۔

سید شجاعت حسین جماعت ہفتم۔ کاون تعلقدار زاسکول لکھنو۔ یوپی۔ انڈیا۔ برٹش ایمپائر زنانہ پارٹ ویران جہاں بیگم۔ ہونق بانو۔ بربادی خانم۔ بیہودہ خاتون۔ آنکھوں پر انگلیاں پھیر کر دریچے سے باہر دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔ حاضرین جلسہ فوراً اٹھے۔ بیرسٹر صاحب نے گلنار سے مخاطب ہو کر کہا "معاف کیجئے گا سفر کی تکان ہے ورنہ تھوڑی دیر اور بیٹھتے۔" بھانجے سے بولے "ذرا میرے ساتھ تشریف لایئے۔" اور چق اٹھا کر باہر۔

اب شام کے پانچ بج رہے تھے۔ کوٹھی کی برساتی میں ایک فٹن آکر رکی۔ بڑھیا سوٹ پہنے' مونوکل لگائے' چرٹ پیتے' نوکیلی مونچھوں والے ایک نیٹو جنٹلمین نے باہر جھک کر برآمدے میں منتظر اور سراسیمہ جمنا مہری کو آواز دی۔ "میاں کو اطلاع کردو...... لاٹ صاحب آئے ہیں۔"

"میاں آپ کا اندر یئے بلاوت ہیں۔" مہری نے جواب دیا۔

کوٹھی کے پچھلے گول چبوترے پر "عدالت" لگی تھی۔ بیرسٹر صاحب متردد انداز میں سگار پیتے آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ لالہ درگا داس رستوگی' شیخ رشید احمد' سب ایڈیٹر اودھ پنچ' میر حقہ اور مرزا گڑگڑی نیم دائرے میں کرسی نما مونڈھوں پر بیٹھے تھے۔ چاروں مجرمین شجو' ننھے' بو اور للو سامنے کھڑے تھے۔

مونوکل والے مہمان کو آتا دیکھ کر بیرسٹر صاحب نے ہاتھ پھیلا کر "آؤ بھائی لاٹ صاحب آؤ بیٹھو۔" کہا اور ایک گہرا سانس لیا۔

لاٹ صاحب یعنی کنج بہاری لعل ماتھر بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے نور نظر لخت جگر برج بہاری لعل ماتھر عرف بو کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورا اور خود بھی آہ سرد کھینچ کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ بہت انگریز آدمی تھے اس وجہ سے حلقہ احباب میں "لاٹ صاحب" کہلاتے تھے۔

"بیٹھ جایئے" صاحب خانہ نے کڑک کر لڑکوں کو حکم دیا۔ وہ ہڑبڑا کر مونڈھوں کے چرمی کناروں پر ٹک گئے اور سر جھکا لیے۔

چند سیکنڈ خاموشی چھائی رہی۔ پھر صاحب خانہ بولے "امیں لاٹ

صاحب! تم کو خوب معلوم ہے اسی شوق نے میرے گھرانے کو برباد کیا۔ دادا جان اور ابا جان ہمیشہ مقروض رہے۔ دولہا بھائی کا علاقہ کورٹ ہوا اور یہ 'لالہ جی ذرا اپنے سپوت کے کارنامے بھی دیکھئے۔" انہوں نے للو کے گانوں کی کاپی ان کے والد درگاداس رستوگی کے ہاتھ میں دی اور کہتے رہے۔ "شجاعت حسین صاحب کو کم از کم ایف اے میں ہونا چاہئے تھا دو سال سے ساتویں کلاس میں فیل ہو رہے ہیں اور سنئے کن علوم میں برق ہیں...... ویران جہاں بیگم۔ بربادی خانم۔ بیہودہ خاتون۔" غم و غصے سے سرخ ہو کر دوسری کاپی بک انہوں نے چبوترے سے دور گھاس پر پھینکی اور ننھے کے والد شیخ رشید احمد سب ایڈیٹر اودھ پنچ کو مخاطب کیا "شیخ صاحب قوم کی نئی پود تھیٹر کے شوق میں غارت ہوئی جا رہی ہے۔ آپ اس کے خلاف قلم کیوں نہیں اٹھاتے؟"

اس وقت تک لاٹ صاحب کا دماغ پوری طرح بھنا چکا تھا۔ انہوں نے سید رفاقت حسین کی بات کاٹ کر اپنے فرزند دلبند کو مخاطب کیا۔ "کیوں بے! گھر چل کر ایسی مرمت کروں گا بچو کہ......امیں جناب عالی اس کا نام لیجئے ہم تو یہ کوشش کرتے کرتے گھسے جا رہے ہیں کہ اولاد سالی جو ہے وہ انگریزی تہذیب سیکھے۔ آدمی بنے۔ متمدن کہلائے اور یہاں وہی تاک۔ دھنا دھن تاک دھنا دھن۔" طیش میں آ کر انہوں نے اپنی چھڑی کو زور سے چبوترے پر پٹخا۔

"کیوں مرزا صاحب! تھیٹر کا اور کون کون ڈوم ڈھاڑی یہاں آتا تھا؟" بیرسٹر رفاقت حسین نے سوال کیا۔

مرزا گڑگڑی دست بستہ گڑگڑائے "صاحب میں تو اس قوم سے زیادہ واقف نہیں۔ بجھائی بھی کم دیتا ہے۔ رتوندی آتی ہے۔ میر صاحب سے دریافت فرمائیے۔"

میر حقہ نے عرض کی "میاں ایک تو وہی دونوں ہیں۔ جی ہاں اور ان کے خان صاحب پیٹی ماسٹر اور......"

"پیٹی ماسٹر کیا ہوتا ہے؟"

"مجورہ جون ہر مونیا بجاوت ہیں" آرام کرسی کے پیچھے کھڑے منہ چڑھے بانکے کوچوان نے تفسیر بیان کی۔

میر حقہ بولے "مگر حلفیہ' جناب امیر کی قسم۔ بڑی بٹیا کی اجازت سے۔"

"جی ہاں' معلوم ہے۔ باجی بیگم اپنے لاڈ پیار میں صاحبزادے کو دو کوڑی کا کر کے چھوڑیں گی۔ ان کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ میں کہاں تک اس ڈوبتی ناؤ کو بچا سکتا ہوں۔ لالہ جی۔ کل سویرے دس بجے تک بنگلہ خالی کروائیے۔"

"بہت بہتر۔"

"اور عزیزی مجو میاں۔ آپ بھی اپنا اسباب باندھنا شروع کیجئے۔ میں کل ہی آپ کے نام کالون سے کٹاتا ہوں اور آپ کو علی گڑھ روانہ کرتا ہوں۔"

عدالت برخاست ہوئی۔ چبوترے پر شیخ رشید احمد اور لاٹ صاحب بیٹھے رہ گئے۔ لالہ درگاداس رستوگی' مرزا گڑگڑی اور میر حقہ کچھ فاصلے پر جاکر نیم تلے مسکوت میں مصروف ہوئے۔ چند منٹ بعد مرزا صاحب چبوترے پر واپس آئے اور کہا "میاں گستاخی معاف ہو تو کچھ عرض کروں؟"

"فرمائیے؟"

"میاں بات یہ ہے کہ یہ مس گلنار جو ہیں یہ کوئی گشتی' کسبی خانگی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ نیو الفریڈ کمپنی کی مشہور......"

"مرزا صاحب! آپ تو کہتے تھے اس قوم سے واقف نہیں۔"

"جی ہاں مگر ہم نے ان کے بارے میں ایسا ہی سنا ہے اور میاں یہاں یہ از خود تو آئی نہیں بلایا تو آئیں اور پیشگی کرایہ ادا کیا ڈبل۔ اور بنگلہ کرائے پر اکثر اٹھتا ہے۔"

"درست' تو پھر؟"

"تو میاں ان سے کن الفاظ میں...... یعنی کس طرح کہا جاوے کہ کل صبح

دس بجے تک مکان خالی کر دو۔"

"کہہ دیجئے ابھی دلی سے تار آیا ہے۔ چند اہم موکل صبح کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس ان کے لیے چاہئے اور ہماری طرف سے معذرت کر دیجئے۔" زچ ہو کر مسٹر ماتھر سے کہا" لاٹ صاحب للہ آپ ہی بتائیے! مس گلنار بائی کے قیام وطعام کا میں کس طرح ذمہ دار ہوں؟"

گلنار مورننگ گلوری کی آڑ میں چھپی "عدالت کی پوری کارروائی دیکھ اور سن رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب کے چہرے پر نظریں جمائے تھیں اور غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایسی توہین' ایسی ناقابل یقین بے عزتی۔ حقہ گڑگڑی کو سر جھکائے بنگلے کی سمت آتا دیکھ کر سرپٹ بھاگی اور اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اگر میرا بس چلے' اگر میرا بس چلے اسی وقت پر لگا کر اڑوں اور یہاں سے دفان ہوں...... کالا منہ کروں۔

5۔ بلبل بیمار

گڑگڑی اور حقہ کے سامنے گلزار بائی ہاتھ چلا چلا کر چلائیں۔ "ہم' ہم بڑے بڑے والیان ریاست کے شاہی مہمان خانوں میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے راجوں نوابوں نے ہم پر اپنے خزانے لٹا دیئے۔ ذرا جا کر اپنے خردماغ بالشڑ سے پوچھو۔ میاں تمہاری اوقات ہی کیا۔ دو ٹکے کے وکیل۔ ذرا ذہور زمینداری۔ ارے ابھی کل کلاں کو میری اباوے کی جائیداد املاک کا کوئی مقدمہ کھڑا ہووے۔ میں ان کی فیس ادا کروں تو دوڑے آئیں اور اب ہم سے بیکڑی کی لیتے ہیں! جیسے ان کی فیس ان کے کام کی۔ ہماری فیس ہمارے کام کی ہم میں ان میں فرق کیا ہے۔

"خدا کے لیے آپا چپ رہیں۔" گلنار نے شرم سے پانی پانی ہو کر التجا کی۔

اس سے قبل کہ گلزار بائی جو نشے میں آؤٹ تھیں زیادہ فحش کلامی پر اتریں حقہ گڑگڑی وہاں سے کھسک لیے۔ ندامت اور غصے کی وجہ سے گلنار کی

حالت غیر تھی اور وہ پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی اس نے منو کو فوراً پسٹن جی کے پاس پام کورٹ ہوٹل دوڑایا کہ رات کے شو میں ڈھیلا بائی سے جو اس کی اسٹینڈ ان تھی، کام کروالیں اور خود جا کر پلنگ پر گر گئی۔

شام ہوئی چراغ جلے بڑی بٹیا نے ہزار معذرت کے ساتھ کھانا بھجوایا جو گلنار نے واپس کر دیا باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اماں دن بھر کی تھکی ماندی اور نشے میں غین ڈرائنگ روم کے غالیچے پر لڑھک رہیں۔ گلنار سگریٹ جلا کر دریچے میں جا بیٹھی رفتہ رفتہ رات کی خاموشی چھائی۔ کوٹھی میں پہلے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

روشنیاں گل ہوئیں۔ رات کی رانی نے باغ معطر کیا۔ مورننگ گلوری کی بیل جہاں ختم ہوتی تھی وہاں سے بیرسٹر صاحب کا بیڈ روم دکھلائی دے رہا تھا۔ اس کی روشنی گیارہ بجے تک جلا کی۔

اچانک گلنار کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ شغل مے کبھی کبھار کرتی تھی اندھیرے میں ٹٹول کر والدہ کی وہسکی سوڈا تلاش کیا' گلاس بنایا پھر کھڑکی میں آ بیٹھی۔ ایک گھونٹ بھرا۔ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ذلت کی زندگی۔ ذلت کی موت۔ ہوا کا جھونکا رات کی رانی کی مہک ساتھ لایا۔ مے ہو وے کنج باغی ہو ساقی ہو ماہوش کوئی مخل نہ ہو وہاں باعث حجاب کا۔ بے حجاب بائی مہ لقا۔ اس جل ککڑے میر حقہ نے فقرہ کسا۔ اس دو ٹکے کے منشی کی یہ ہمت۔ ذلت کی زندگی ذلت کی موت۔ تیرے کوچے سے۔ تیرے کوچے سے اتنا غرور۔ اللہ مجھے جہاں پیدا کیا وہاں پیدا ہو گئی۔ اس میں میرا کیا قصور۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ اماں بے خبر سو رہی تھیں۔ اٹھ کر پھر منہ دھویا۔ آنکھوں پر چھپکے مارے بیڈ روم کی بتی جلا کر آئینے میں صورت دیکھی۔ جوڑے کے گرد لپٹی سفید نقلی موتیوں کی مالا اتاری۔ کلکتے میں ایک بار ایک بہت پڑھے لکھے عاشق نے کہا تھا: "میڈم تم تو بالکل روی ورما کی پینٹنگ کے موافق معلوم دیتا ہے۔" بتی بجھا کر پلنگ پر اوندھی گر گئی۔ مچھروں نے ستایا تو پھر اٹھی۔ برآمدے میں نکل آئی۔

سامنے ایک کھدی ہوئی کیاری درختوں کے اندھیرے میں قبر کا گڑھا سا معلوم ہو رہی تھی۔ جب بڑھیا ہو جاؤں گی تو کفن کا چونگا کسی واہیات آدمی، کسی بوڑھے بد قوارہ میر شکار کا سہارا۔ شاید وہ بھی نہ ملے آپ کی حالت۔ اس بے تکے بوبک مرزا گڑگڑی ہی کو غنیمت سمجھ رہی تھیں۔ بے چاری آپا اور جب میں مروں گی، مروں گی۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر یاد کرنے لگی۔ جب مونگا خالہ مری تھیں۔ اناوے میں ان کے جنازے کے ساتھ قبرستان کے راستے نوکروں روٹیاں بانٹنے گئے تھے۔ آپا نے بتایا تھا ہماری برادری کا دستور ہے مرنے والی کی بخشش کے لیے گناہوں کی معافی کے لیے روٹیاں بانٹتے ہیں۔ جھرجھری سی آئی، بہت ڈر لگا۔ کیاری کے گڑھے سے نظر بچا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ غالیچے پر اکڑوں بیٹھ کر ماں کو جھنجھوڑا۔

گلزار بائی آنکھیں بند کیے کیے ہنکاریں "اری نابکار مردار سونے دے اوندھی قسمت آگ لگے۔"

"آپا آپا۔ جب مونگا خالہ مری تھیں۔ ان کے جنازے کے ساتھ روٹیاں کیوں بانٹی گئی تھیں۔ جب میں مروں گی میرے جنازے کے ساتھ کتنے من روٹیاں......"

والدہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھیں۔ جھبرے کھچڑی بال سمیٹے۔ اندھیرے میں چڑیل معلوم ہو رہی تھیں۔ "جنازہ؟ کس کا؟ آگ لگے۔ کل جبھی۔ حرامزادی۔ مردار۔ کرموں جلی۔ ارے ٹیڑ مونہی پنا تو بن جائے نواب الماس محل اور تو کم بخت تیرے یہ نصیب کہ ایک ٹٹ پونجئے وکیل نے کمپنی کے سامنے تیری بے عزتی کر دی۔ اپنے نوکروں سے جوتے لگوائے کتیا کے سر پر۔"

"اچھا۔ اچھا۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ گلنار نے کہا۔ وہ پھر فی الفور فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ اور کروٹ بدل خراٹے لینے لگیں۔

اب چاند نکل آیا تھا۔ باغ سو رہا تھا۔ تاریخ گھنے درختوں میں گھری سفید کوٹھی چاندنی میں چمکنے لگی۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر باہر آ گئی

اور روش پر ٹہلنے لگی پھر بے اختیار اس کے قدم بیرسٹر صاحب کے بیڈ روم کی سمت اٹھے۔ نیچی کرسی کی کوٹھی تھی۔ دبے پاؤں چلتی وہ کمرے کے کھلے دریچے کے نیچے پہنچ گئی اور سائے میں ہو کر اندر جھانکا۔ کمرہ چاند کی روشنی سے منور تھا۔ چاندنی بیرسٹر صاحب کے حسین و جمیل چہرے پر پڑ رہی تھی وہ دریچے کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر دلیری سے اندر جھانکنے لگی پھر ہٹ کر بوگن ولا کے سائے میں کچھ ہو گئی اور سوچنے لگی۔ قسمت کی ستم ظریفی پیدائش کے اتفاقات۔ میں کون ہوں۔ وہ بھولی معصوم پردہ نشین شریف زادی کون ہے جو مولوی صاحب کے مدرسے میں پڑھ رہی ہے اور اس گلفام کی دلہن بننے والی ہے اور وہ خود کون ہیں ہم سب کون ہیں۔ کیا ہیں۔ سارا ماجرا کیا ہے۔ گورکھ دھندا۔ میر حقہ معذرت کر رہے تھے بیرسٹر صاحب اپنے تیز مزاج اور اپنے حالات سے مجبور ہیں۔ تو میں بھی اپنے حالات سے مجبور ہوں تو ناحق ہم مجبوروں پر......

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ اسی طرح دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اندر جھانکا۔ مہاراجہ کوڑیاں کھولو رس کی بوندیں پڑیں۔ بیرسٹر صاحب نے کروٹ بدلی۔ خواب میں بڑبڑائے۔ قربانت شوم۔ سوتے میں بھی حضور کا مزاج سیدھا نہیں ہوتا۔ آواز دے کر جگاؤں۔ پھر ممکن ہے قسمت بدل جائے جیسے پنا کی قسمت بدلی۔ صرف ایک پل میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے انسان ادھر یا ادھر جگاؤں۔ اجی صاحب کچھ اپنے دل کی کہو کچھ ہمارے دل کی سنو۔ یہ اعتبار نہیں ہم رہے رہے نہ رہے۔ اس لمحے اسے اپنی حالت پر شدت کا رونا آیا۔ اچانک بجری پر اوھوڑی کے جوتوں کی چاپ سنائی دی۔ چوکیدار ڈنڈا بجاتا پھاٹک کی سمت چلا آ رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بھاگی اور بنگلے پر آ کر دم لیا۔ تیز دوڑنے سے سانس پھول گیا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ چوکیدار ''ہو ہو' کرتا دوسری طرف نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ والدہ جاگ گئی تھیں وہ بھی ناک سڑک سڑک کر روتی جاتی تھیں اور

کمرے کی بتی جلا کر سامان سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ باہر چاند کا اجالا پھیکا پڑتا جارہا تھا۔ کوئی دم میں مرغ بانگ دیں گے۔ کوچ کا وقت قریب تھا ایک بار پھر کوچہ گردی۔ برٹش انڈیا ایمپائر کے چھوٹے شہروں میں کمپنی کی چھولداریاں شوقین رؤسا کے مردانخانے۔ بڑے شہروں میں ہوٹل۔

6۔ گلروز زرینہ

سوائے ہوٹل۔ مسوری 1935ء

ولایتی ڈریسنگ گاؤن میں ملفوف ہزہائی نس بیڈروم سے نکل کر لاؤنج میں آئے اور زیرلب اشلوک پڑھتے ہوئے دریچے سے باہر دیکھنے لگے۔ جہاں ہوٹل کی سرخ چھتوں کے پرے برف پوش پہاڑ اپریل کے آخری دن کی سرد دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ چند منٹ بعد مہاراجہ صاحب صوفے پر دھم سے بیٹھ گئے اور برابر کے کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی "ڈارلنگ......ڈارلنگ۔"

جواب ندارد۔ عمر رسیدہ مہاراجہ صاحب اتنے فربہ تھے کہ چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا ان کا خادم نمودار ہوا۔

"مہاراج۔"

"میم صاحب کہاں ہیں؟"

"منروا ہوٹل گئی ہیں۔"

"اس وقت؟"

"ان کی مدر کی طبیعت ایک دم خراب ہوگئی۔ ٹیلیفون آیا تھا۔ سرکار اشنان کر رہے تھے۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ سرکار کو بتادوں۔"

"ہمیں تیار کرو۔"

"حکم۔"

خدمت گار نے سہارا دے کر مہاراج ادھیراج کو پھولدار صوفے سے اٹھایا۔ اندر لے جا کر نفیس اسکاٹش کوٹ پتلون زیب تن کروائی چارخانہ کیپ

لگائی راجہ صاحب ملازم کے سہارے باہر آکر زینہ اترے۔ کوٹ یارڈ سے نکل کر رکشہ میں بیٹھے منروا ہوٹل کا رخ کیا جہاں ان کی منظور نظر پارسی اسٹیج اور خاموش سینما کی نامور اداکار گلنار بائی کی ضعیف العمر والدہ گلزار بائی صاحبہ' تیرہ سالہ بیٹی گلرو' چھوٹا بھائی اور بمبئی کی بولتی فلموں کا ڈانس ڈائریکٹر ماسٹر منو' ملازمہ کندن اور گلرو کی دیسی عیسائی استانی مس ناس مقیم تھیں۔ جس وقت ہز ہائی نس ہوٹل کی نچلی منزل کے کونے والے لاونج میں پہنچے بائی گلزار بائی صاحبہ کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ وہ عنابی بنارسی شال میں لپٹی پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی بریک فاسٹ اڑا رہی تھیں۔ پایوں والی ٹرے، گلابی ساٹن کے لحاف پر ان کے سامنے دھری تھی۔ گلنار ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ ٹوسٹ پر مکھن اور جام لگا لگا کر انہیں دیتی جا رہی تھی لیکن دونوں ماں بیٹیاں بہت غمگین نظر آتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ بہت رو چکی ہیں دریچے کے سامنے میز پر نیلے رنگ کے اونی فراک میں ملبوس گلرو انگریزی کی تیسری کتاب کا ایک سبق اٹک اٹک کر پڑھنے میں مصروف تھی۔ ادھیڑ عمر کی کالی میم نیچا سا سفید فراک اور سرخ کارڈیگن پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

ہز ہائی نس کمرے میں داخل ہوئے۔ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ گھبرا کر گلنار سے دریافت کیا "کیا ہوا؟...... خیریت۔"

گلنار نیپکن سے انگلیاں پونچھ کر ایک کرسی پر ٹکی' خاموش رہی اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے سر اوپر نیچے ہلایا۔ مہاراجہ صاحب نے پریشان آواز میں کہا...... "ڈارلنگ...... " وہ گلنار پر جان دیتے تھے۔

"آغا صاحب جنت کو سدھارے" گلزار بائی نے منہ چلاتے چلاتے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں تو صبح سو کر اٹھی ہی تھی کہ مس صاحبہ نے اخبار پڑھتے پڑھتے خبر سنائی۔ لاہور میں انتقال ہوا۔"

"نانی کو غش آگیا......" گلرو نے اپنی کتاب بند کر کے حاشیہ آرائی کی۔ "میں نے گھبرا کر ممی کو فون کیا۔"

''آغا صاحب گزر گئے...... او مائی گاڈ۔'' مہاراجہ نے دلی افسوس کے لہجہ میں آہستہ سے کہا...... ''وہ بڑا جینیس آدمی تھا۔ انہوں نے استانی کو مخاطب کر کے اظہار خیال کیا۔

''یس یور ہائی نس'' کالی میم نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا ہم سنا ہے انڈیا لوگ ان کو انڈین شیکسپیئر بولتا تھا۔''

گلزار اور گلنار نے اپنے اپنے کانوں کی لویں چھوئیں اور آنسو خشک کیے۔

''آغا صاحب کی موت مہاراجہ صاحب نے اپنے آپ سے انگریزی میں کہا۔ ''انڈین تھیٹر کے تابوت میں آخری کیل ہے۔ ...... ڈارلنگ......'' اب وہ اردو میں گلنار سے مخاطب ہوئے ''اتنا غم نہ کرو۔ تمہاری صحت پر برا اثر پڑے گا۔''

گلنار اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔ دبیز ریشم کی فیروزی ساڑھی میں ملبوس شانوں پر چیتے کی کھال کا کوٹ ڈالے بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ مہاراجہ صاحب کے موروثی خزانہ کا ایک انتہائی بیش قیمت اور نایاب نیلا ہیرا اس انگوٹھی میں جگمگا رہا تھا۔

''ممی نے آغا صاحب کے اتنے ڈراموں میں کام کیا۔'' گلرو نے مس نامس کو بتانا شروع کیا۔ ''اسیر حرص...... صید ہوس......''

''نہیں' سب سے پہلے خوبصورت بلا...... ''گلزار بائی نے تصیح کی...... اس وقت تو میری گلو صرف بارہ سال کی تھی......''

مس نامس منہ پھیر کر زیر لب مسکرائیں۔

گلزار بائی کہتی رہیں...... ''خوبصورت بلا...... پھر یہودی کی لڑکی......''

''اے ہاں آگ لگے بولتے فلموں کو کیا ہمارے ناٹکوں کا مقابلہ کریں گے پھر تم سمجھو اسیر حرص...... صید ہوس...... سلور کنگ' ترکی حور' بن دیوی۔ وہ زمانے ختم ہوئے۔''

وہ زمانے ختم ہوئے۔ سٹیج کے پرانے ساتھی چھٹ گئے۔ ماسٹر فیروز نے

شراب پی پی کر جان دے دی۔ اختر آفندی کی آواز بیٹھ گئی۔ ریس کورس پر سارا جمع جتھا ہار گئے۔ فقیری لے لی اجمیر شریف کی درگاہ پر جا پڑے۔ ڈھیلا بائی خاموش بائی سکوپ کی مقبول ایکٹریس بن گئی تھی۔ فلمی نام مس ڈولی۔ ٹاکی کے نئے دور میں گلنار کی طرح وہ بھی ناکام رہیں۔ گلنار دو تین ٹاکی فلموں کی ہیروئن بن گئی تھیں مگر ریٹائر ہو گئیں۔ اب کام کرنے کی نہ عمر ہے نہ ضرورت۔ اللہ نے بہت دھن دولت دی۔ صندوقچے ہیرے جواہرات سے پٹے پڑے ہیں۔ بڑی محنت کی کمائی ہے بس کفن کا چونگا کر لیا۔

اب اللہ گلرو کو اسی طرح کامیاب کرے۔ گلنار نے سر اٹھا کر بیٹی کو دیکھا جو پھر انگریزی کا سبق یاد کرنے میں جٹ گئی تھی۔ "جاؤ تمہارے ریاض کا وقت ہے۔" گلنار نے اس سے کہا۔ لڑکی کا دیدہ پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا۔ مگر آج کل کے زمانے میں انگریزی کی تھوڑی سی شد بد بہت ضروری ہے۔ لڑکی فوراً اٹھی دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ گلنار نے فوراً ڈانٹا ہز ہائی نس سے اجازت لو تسلیم عرض کرو۔" اس عمر میں قدم قدم پر تربیت کی ضرورت ہے ورنہ ڈیرے دار طوائفوں کی شائستگی اور تہذیب کے محض افسانے ہی باقی رہ جائیں گے۔

گلرو ماں کی طرح حسین نہیں۔ سانولی رنگت، معمولی ناک نقشہ۔ یاد نہیں پڑتا اس کا باپ کون تھا۔ شاید کوئی مارواڑی تھا۔ مگر پاک پروردگار نے شکل کی کسر آواز سے پوری کر دی۔ ماشاء اللہ کوئل۔ گانے کی باقاعدہ تعلیم لے رہی ہے۔ پانچ چھ سال بعد بمبئی کی سینما انڈسٹری پر آواز کے بل ہی چھا جائے گی۔ انشاء اللہ۔ جب پیدا ہوئی کلکتہ میں دیوالیہ جوبلی تھیٹر کمپنی کے مشہور ناٹک گلرو زرینہ کو پسٹن جی خریدنا چاہتے تھے۔ وہ معاملہ تو نہ پٹ سکا، گلنار نے لڑکی کا نام گلرو زرینہ البتہ رکھ لیا۔ اللہ مبارک کرے۔

مہاراجہ صاحب اٹھنے کے لیے کسمسائے گلزار نے فوراً ان کے چیمبر لین کو بلایا۔ ماں کو خدا حافظ کہا۔ باہر نکل کر خود دوسری رکشا میں سوار ہوئی۔ دونوں رکشائیں میں سوائے کی طرف چلیں۔

شام کو ہز ہائی نس نے کہا "ڈارلنگ تمہاری طبیعت بہل جائے گی چلو ہیک مینز ہو آئیں۔" چنانچہ ہیک مینز گئیں۔ بال روم ناچنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں پچھلے چبوترے پر جا بیٹھے۔ ایک نوجوان ہندوستانی جوڑا والتس کرتے کرتے باہر نکل آیا۔ گلنار نے چونک کر انہیں دیکھا اور سوچا ہمیں تو اللہ نے جہاں پیدا کر دیا وہاں پیدا ہو گئے۔ مگر اب یہ شریف زادیاں کیا کر رہی ہیں۔

چبوترے پر لوگ آ کر بیٹھ رہے تھے "اچھا مسٹر جسٹس حسین بھی مسوری آئے ہوئے ہیں۔" مہاراجہ صاحب اچانک بولے۔

"کون ہے؟"

"وہ...... جو سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ سلور گرے بالوں والے۔"

گلنار نے سر اٹھا کر ادھر نظر ڈالی سید رفاقت حسین اب آنریبل مسٹر جسٹس حسین ایک کونے میں بیٹھے اپنے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔

مہاراجہ صاحب بیچارے مارے موٹاپے کے نہ رقص کر سکتے تھے، نہ چہل قدمی، نہ بال روم میں بیٹھ کر رقص ملاحظہ کرنا ہی ان کے بس کی بات تھی۔

"آؤ اندر چلیں انہوں نے تھوڑی دیر بعد گلنار سے کہا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ چوبدار جواب تک کونے میں موجود تھا، سامنے آیا، سہارا دے کر ہز ہائی نس کو اندر لے گیا۔ وہ پیچھے پیچھے گئی۔ سید رفاقت حسین کی میز کے پاس سے گزری وہ اسی طرح احباب کے ساتھ مصروف گفتگو رہے۔ اچٹتی نگاہ سے بھی اسے نہ دیکھا۔

7۔ جلتی نشانی

لکھنو 1939ء وہ چوک میں کھن کھن جی کی دکان سے نکل رہی تھی۔ برآمدے میں ایک کمر خمیدہ بوڑھا جاتا نظر آیا۔ سیاہ ایرانی ٹوپی۔ سیاہ شیروانی۔ شانے پر مشہدی رومال۔ بے حد چوڑے پائنچے کا میلا سا پاجامہ اور کمانی دار عینک۔

"مرزا صاحب، مرزا صاحب۔" گلنار نے لپک کر زور سے پکارا۔ مرزا

گڑگڑی نے پیشانی پر ہاتھ کا سایہ کر کے آنکھیں چندھائیں۔ غور سے دیکھا "گلنار بائی صاحب آپ!"

"تسلیم مرزا صاحب، مزاج شریف۔"

"جیتی رہیئے۔ آپ یہاں کہاں؟ آپ تو سنا ہے اب بمبئی میں رہتی ہیں۔"

"میری لڑکی استاد مدن خان صاحب سے تعلیم لے رہی ہے اس لیے یہاں آگئی ہوں۔ سبزی منڈی میں کمرہ لیا ہے۔ بینظیر کے کمرے کے برابر۔ آپ کے یہاں سب خیریت ہے۔ آپا آپ کو اکثر یاد کرتی ہیں۔ میر حقہ کیسے ہیں؟"

"وہ غریب تو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ہمارے جوڑی دار تھے۔ ہم اکیلے رہ گئے۔ پانچ چھ برس ہو گئے انہیں بھی مرے۔"

"چچ چچ چچ...... بڑا افسوس ہوا۔ اور سنایئے مجو میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

"آپ نے خوب یاد رکھا جی ہاں۔ اللہ کا کرم ہے راجہ صاحب نے علی گڑھ سے ایف اے پاس کر لیا۔ بیاہ ہو گیا۔ اب ماشاء اللہ سے تین بچوں کے باپ ہیں۔ اپنے علاقے پر رہتے ہیں۔ بڑی بٹیا ان کی والدہ...... بھی وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ ہمارے کے ہاں...... کلائیڈ روڈ پر بھی سب خیریت ہے میاں...... جج صاحب...... کے ہاں خدا کا دیا ایک ہی لڑکا ہے۔ میاں کو بڑی فکر تھی کہ بھیا لکھنو میں رہے تو کہیں بری صحبت میں نہ پڑ جائیں۔ گیارہ سال کے تھے جب میاں نے انہیں ولایت لے جا کر بورڈنگ سکول میں ڈال دیا۔ دلہن بیگم بہت روئیں پیٹیں، مگر میاں کس کی سنتے ہیں۔ اب ہر دوسرے سال جا کر بھیا سے مل آتے ہیں یا بھیا خود چھٹیوں میں ولایت سے تشریف لے آتے ہیں۔ آج کل بھی آئے ہوئے ہیں۔ اب خدا کے فضل سے اٹھارہویں سال میں ہیں۔ کنبے میں نسبت ٹھہر گئی ہے۔ بلکن کل ہی اس کی تقریب ہے...... ہم اسی سلسلے میں یہاں کچھ خریداری

کے لیے آئے تھے۔"
پھر مرزا اگڑگڑی گلنار کو خدا حافظ کہہ کر اسی طرح جھکے جھکے ایک دکان کی طرف بڑھ گئے۔

جج رفاقت حسین کے خلف الرشید سید شفاعت حسین عرف شفو (جو ونچسٹر پبلک سکول میں شف کہلاتے تھے) انگلینڈ سے جب بھی دو ماہ کے لیے لکھنو آتے یہاں کے ماحول کی ہر چیز کو حیرت سے دیکھتے۔ بڑے ہو کر ان کے تحیر استعجاب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے "لاٹ صاحب چاچا" ان پر بہت نازاں تھے اور کف افسوس ملتے تھے کہ ان کے اپنے بیٹے ببو جی لا مارٹینئیر کالج کی تعلیم کے باوجود اجڈ نکل گئے۔ جناب عالی! ہم نے تو چاہا تھا اسے آدمی بناتے تہذیب سکھاتے۔ شفو میاں کو دیکھئے بات چیت چال ڈھال طور طریقے سے بالکل انگریز معلوم ہوتے ہیں' مگر ہمارے ببو رہے وہی نیٹو کے نیٹو (الاٹ صاحب کے صاحبزادے ببو جی یعنی برج بہاری لال ماتھر ڈپٹی کلکٹر اضلاع میں بیوی بچوں کے ساتھ گھاسٹر پاسٹر زندگی گزارتے تھے' جاڑوں میں لڑکپن کے ساتھی راجہ شجاعت حسین کے ساتھ ترائی کے جنگلوں میں شکار کھیلتے تھے اور اپنے حال میں مگن تھے)۔

منگنی کی تقریب کے چند روز کے بعد شفو بھیا بمبئی جا کر اسٹریلتھ مور جہاز سے انگلستان روانہ ہونے والے تھے۔ ماہ جون کی ایک تپتی شام کلائیڈ روڈ کی کوٹھی کے پچھلے چبوترے پر اپنے چند ہم عمر رشتے داروں کے ساتھ بیٹھے تھے' گرمی سے برا حال تھا اور رشتے دار ان کو لکھنو کے عجائب و غرائب سے روشناس کرانے پر تلے ہوئے تھے۔

"چوک میں" شفو کے خالہ زاد بھائی اجو نے کہا "آج کل بہار آئی ہوئی ہے اگلے وقتوں کی ایک ایکٹریس ہے گلنار بائی...... اس کی لڑکی ہے جناب...... گلرو بانو...... کیا گاتی ہے بس قیامت ہے...... چلتے ہو۔ اس کا گانا سنوا لائیں۔"

"جی ہاں اور ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو ہمیں الٹا لٹکوا کر پہلے ہماری کھال

کھنچوائیں گے پھر اس میں بھوسہ بھر دیں گے۔"شفو نے جواب دیا۔

"یار عجیب بزدلے ہو...... یعنی ان کو دیکھئے۔ انگلستان میں رہتے ہیں سات آٹھ برس سے اور جنے کب تلک رہیں گے روم اور پیرس میں گھوم آئے۔ یہاں چپکے سے چوک تلک نہیں جا سکتے۔ اماں تمہارے انگلستان پر تین حرف۔ وہاں مرد آدمیوں کو یہی بزدلی سکھلائی جاتی ہے؟"

"اٹاری پر گرا کبوتر آدھی رات۔" گلرو نے دادرہ شروع کیا۔ گلنار بائی ٹھسے سے مسند پر بیٹھی تھیں' سامنے پان دان رکھا تھا۔ گلزار بائی گاؤ تکیے سے لگی پوپلے منہ میں مرمرے چبا رہی تھیں۔ کمرہ خوب ہوادار تھا اور چھت کا برقی پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا' مگر گرمی کے مارے شفاعت حسین کی حالت تباہ تھی' وہ کچھ دیر تک دادرے کے بول سنتا رہا پھر چپکے سے اجو سے پوچھا......"کبوتر گرا آدھی رات کیا مطلب؟"

PIEGON FELL AT MID NIGHT اجو نے سمجھایا۔

"ہاؤ سلی۔" اس نے زیر لب کہا اور اکتا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یاد آیا۔ تہذیب کا تقاضا ہے جب کوئی گا رہا ہو بے دھیانی یا اکتاہٹ ہرگز ظاہر نہ کرو۔ مغنیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اب اجو نے غزل کی فرمائش کی۔ گلرو جب اس مصرعہ پر پہنچیں ع

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل

اجو نے خود ہی چپکے سے شفو کے کان میں ترجمہ کیا

"DO NOT BURY ME IN YOUR LANE AFTER MURDERING ME."

"گذ نس گریشس......" شف بڑبڑایا۔ یہ کھسر پھسر آداب محفل کے بالکل خلاف تھی۔ گلنار بائی نے گھور کر دیکھا۔ شف جھینپ کر باہر تاکنے لگا۔ نجی محفل تھی اور ان دونوں لڑکوں کے علاوہ کمرے پر اور کوئی موجود نہ تھا۔

گلرو ریں ریں کرتی رہی۔ شف نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پرانا

دھرانا فرنیچر' چھت میں جالے۔ باہر شکستہ سی بالکنی چوک کے ان ہی بالا خانوں کے اتنے افسانے ہیں۔ پیرس کا پگال' لندن کا سوہو اور اپنے لکھنو کا یہ بوسیدہ گندہ سندہ چوک۔ اس نے اداسی سے سازندوں پر نظر ڈالی۔ بونا سارنگی نواز بچھوے نما طبلچی۔ ایک منحنی مخنث سا آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا۔ اجو نے بتایا تھا کہ گلرو کا ماموں ہے۔

غزل کے بعد ٹھمری

ارے پی کو ملن کیسے جاؤں......

ہمارے معاشرے میں اتنی افسردگی اتنا رونا پیٹنا کیوں ہے شف سوچتا رہا۔

......پیاں پڑت ہوں بنتی کرت ہوں۔

ہندوستانی عورت گاتی ہے تب بھی بسورتی ہے۔ غزلیں ہیں تو ان میں نالہ و فریاد' آہ و بکا' خون دل' درد جگر' لاشیں' قتل' خون' کفن' دفن' مزار' قفس' صیاد' جنون' دیوانگی' وحشت' صحرا بے چارے لاٹ صاحب چاچا ٹھیک تو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اہل یورپ جیسی بشاشت' چونچالی' صحت مندی' جوش حیات' ولولہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ گلرو شف کی ہم عمر تھی مگر رونی صورت۔ ماں کے چہرے پر بے پناہ حزن' سازندے سب مصیبت کے مارے' نانی البتہ اس بڑھاپے میں ہشاش بشاش بنی ٹھنی بیٹھی مرمرے کے پھنکے لگا رہی تھیں۔ اسے نانی بہت دلچسپ لگیں۔ کونے میں بیٹھی چیل کی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

شف اب بے طرح اکتا چکا تھا۔ خدا خدا کر کے گانا ختم ہوا۔ دونوں نوجوان اٹھے اجو نے گلنار بائی سے پوچھا "بائی صاحب چند سال ہوئے ایک فلم آئی تھی جلتی نشانی۔ سنا ہے اس میں آپ نے بھی کام کیا تھا۔"

"ہاں بیٹا۔" گلنار نے وقار کے ساتھ جواب دیا۔ "ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔ سینما سے تو میں ریٹائر ہو چکی ہوں۔"

دروازے کے قریب رکھے ہوئے بوٹ پہننے کے بعد شف نے خالص

انگلش پبلک سکول کے بوائے سٹائل میں ایک خفیف سے جھٹکے سے سر خم کر کے گلنار بائی، گلرو اور گلزار سے مصافحہ کیا۔ سب سازندوں کا شکریہ ادا کیا اور سب کو گڈنائٹ اور گڈبائی کہہ کر دروازہ کی طرف بڑھا۔ اجو نے گلنار بائی کے خاصدان میں کچھ رقم رکھنا چاہی۔ انہوں نے بڑی آزردگی سے کہا۔ "میاں تمہارے گھرانے سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ ہمیں کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔"

تنگ و تاریک زینہ اترتے ہوئے شف نے اپنے کزن سے دریافت کیا۔ "اجو یہ بیچاری لڑکی جو گا رہی تھی اس نے ناک میں اتنی بڑی رنگ کیوں پہن رکھی تھی اس رنگ سمیت اس نے گانا تو گا لیا مگر کھانا کیسے کھاتی ہو گی؟"

"یار۔" اجو نے جواب دیا۔ "اب تم سیدھے اپنے ڈنچسٹر واپس جاؤ۔"

نوجوانوں کے نیچے اترتے ہی گلنار اور گلرو بام پر گئیں اور جنگلے پر جھک کے نیچے دیکھنے لگیں۔ وہ دونوں موٹر میں سوار ہوئے۔ موٹر گلی سے نکلی اور نکڑ پر جا کر غائب ہو گئی۔ گلنار نے آہستہ سے کہا "بالکل باپ کا ہم شکل ہے اور وہی مزاج۔"

گلرو نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

8۔ گردباد

لکھنؤ 1967ء ماہ جون۔ صبح گیارہ بجے کا وقت۔ بوڑھے پھونس جسٹس رفاقت حسین صاحب اور ان کے صاحبزادے سید شفاعت حسین کلائیڈ روڈ پر اپنی کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں چپ چاپ بیٹھے سامنے تک رہے تھے جہاں ویران باغ میں اینٹوں سے لدے ٹرک کھڑے تھے۔ سیمنٹ کی بوریوں کی گرد اڑ رہی تھی اور راج مزدوروں کا شور مچ رہا تھا...... دور دھوپ میں چمکتی سنسان کلائیڈ روڈ پر سے اکادکا سائیکل رکشا یا کار نکل جاتی تھی۔ پھر ایک بگولہ تیزی سے گھومتا سڑک پر سے گزرا۔

زرد پتے گرد کے اس رقصاں بھنور میں چکر کاٹتے جا رہے تھے۔ سید

شفاعت حسین نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا کہ بگولہ کتنی دور جاکر کہاں معدوم ہوتا ہے' لیکن پل کی پل میں وہ غائب ہو گیا۔

شفو میاں دوبارہ اپنی سیاسی تقریر کے مسودے کی طرف متوجہ ہوئے' جو وہ تیسرے پہر کو' اپنی پارٹی کے ماہانہ جلسے میں پڑھنے والے تھے۔ اے لیجئے۔ کمبخت بال پوائنٹ کا ریفل بھی ختم ہو گیا۔

جھنجھلا کر قلم باہر پھینک دیا۔ پھر اجاڑ باغیچے کو تکنے لگے جہاں نئی نئی سرخ اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔

ان کے والد جج صاحب نے آپ ہی آپ بولتے ہوئے ایک ہنکارا بھرا اور نیشنل ہیرلڈ اٹھا کر اپنی آنکھوں کے بے حد قریب لے گئے۔

"ڈیڈی...... پھر پڑھنے لگے۔ کتنی بار آپ کو منع کیا ہے کہ آنکھوں پر زور نہ ڈالئے۔"

"شٹ اپ" ڈیڈی نے ڈانٹ پلائی اور لرزاں ہاتھوں سے یے اخبار کے ورق کھڑ کھڑائے جج صاحب ہمیشہ کے ۶غصیلے تھے۔ پیرانہ سالی نے اور زیادہ کٹ کھنا اور ضدی کر دیا تھا صاحبزادے بھی تند مزاج تھے۔ اکثر دونوں باپ بیٹوں میں بات بے بات جھوڑ ہوا کرتی۔

سید شفاعت حسین عرف شفو (جن کو باپ اب بھی کبھی پیار سے شف پکارتے تھے) ان لوگوں میں تھے' جنہیں امریکن اصطلاح میں NON - ACHIEVER کہا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بہت شاندار تھا۔ آگے چل کر ٹائیں ٹائیں فش۔ باپ نے گیارہ برس کی عمر میں انگلینڈ پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ 39ء کے موسم گرما میں جب لکھنؤ آکر واپس گئے اس کے ایک مہینے کے اندر جنگ چھڑ گئی۔ جج صاحب نے گھبرا کر براہ آئرلینڈ گھر واپس بلا لیا۔ یہاں پہنچ کر شف جھلارے جھلارے رہے۔ اس ملک اور اس شہر کی ہر چیز دقیانوسی' فرسودہ' پھٹیچر یونیورسٹی میں داخل کیے گئے۔ باقی وقت محمد باغ کلب میں انگریزوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں گزارتے۔ منگنی ہو چکی تھی۔ ماں نے اس

خیال سے کہ بیٹے کا دل لگ جائے' بیس برس کی عمر میں ہی شادی رچا دی لیکن دولہا انگلش پبلک سکول بوائے' دلہن مٹی کا مادھو' موم کی مریم۔ اللہ کا حی۔ شف کا دل ان سے کیا لگتا۔ ادھر دو تین عشق کیے وہ بھی ناکام۔ اس ملک کی لڑکیاں تمام جھینپو' کم ہمت اور کوڑھ مغز۔

جس بے دلی سے شادی کی تھی اسی بے دلی سے بی اے ایل ایل بی کر ڈالا۔ وکالت شروع کی وہ چلی نہیں۔ دراصل تحصیل معاش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ باپ بڑے آدمی' دولت وافر شف اس انتظار میں کلبوں اور پہاڑوں پر وقت گزارتے رہے کہ انگلستان کے حالات ذرا بہتر ہوں تو واپس چلے جائیں' مگر بعد از جنگ انگلستان نے اٹھا کر ہندوستان کو آزاد کر دیا۔ باپ ریٹائر ہو چکے تھے۔ تعلقہ ضبط ہوا' آمدنی گھٹنا شروع ہوئی۔ شف اب پولیٹکس کی طرف متوجہ ہوئے۔ صوبائی الیکشن لڑا' باقی ماندہ روپیہ اس میں پھونک دیا۔ الیکشن ہار گئے یعنی ایک تو نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ باپ اور دوستوں نے بہتیرا سمجھایا تھا میاں سیاست تمہارے بس کا روگ نہیں۔ مگر باپ ہی کی طرح ضدی۔ کہاں مانتے۔ اب خود اپنی پارٹی بنائی۔ اس میں لگ گئے گردش زمانہ نے ساری صاحبیت نکال دی تھی۔ شیروانی پہنے تانگے پر سوار جگہ جگہ تقریریں کرتے پھرتے تھے۔ آمدنی جس رفتار سے کم ہوئی اسی تیزی سے بچوں کی تعداد میں اضافہ۔ بیوی اتنی زرخیز اور اولاد کی شوقین کہ آٹھ نونہال پیدا کر کے ہی ریٹائر ہوئیں۔ گرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات دائم المریض والدین کا مہنگا علاج۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ بنائے رکھنے کی فکر' مجبوراً کوٹھی کا آدھا حصہ کرایہ پر اٹھانا پڑا۔ بقیہ پانچ کمروں میں مع خاندان منتقل ہوئے پھر طوطے والا بنگلہ فروخت کیا۔

جس روز طوطے والا بنگلہ بکا ہے مرزا گڑگڑی نے میلے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بیع نامہ خاموشی سے لا کر ان کی میز پر رکھا۔ ایک پرچے پر صرف اتنا لکھ کر چھوڑ گئے...... ب' ٹ' ت' ر' ط' ت' ب' چ' یہ مرزا گڑگڑی کے ساتھ ان کے بچپن کا ایک لطیفہ تھا۔

جب کوٹھی کا شمالی قطعہ زمین فروخت کیا گیا۔ مرزا گڑ گڑی پیوند خاک ہو چکے تھے۔ کوٹھی کا نصف احاطہ خرید کر اس کے نئے مالک نے "ملٹی سٹوری اپارٹمنٹ بلاک" بنوانا شروع کر دیا۔ پچھلے دو تین مہینے سے کمپاؤنڈ میں دن بھر ہنگامہ رہتا۔ اینٹوں کے ٹرک' راج مزدوروں کا غل' اجنبی چہروں کا ہجوم' بیرونی برآمدے کے آدھے حصے کے علاوہ بیٹھنے کے لیے اب اور کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی۔ بحالت مجبوری دونوں باپ بیٹے وہیں کرسیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔

بہت دنوں تک جیتے رہنے کی ایک سزا یہ ہے کہ بیشتر دوست احباب اور رشتہ دار پہلے مر کر تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ جج صاحب کے دکھ سکھ کے ساتھی لاٹ صاحب کو سورگ باشی ہوئے دس برس ہونے آئے۔ وفادار جاں نثار سابق منیجر لالہ درگاداس رستوگی کو بیکنٹھ سدھارے پندرہ سال ہو گئے۔ باجی بیگم کی وفات کو مدتیں گزر گئیں۔ میر حقہ' مرزا گڑ گڑی داستان پارینہ میں شامل ہو چکے اور بہت سے اسی طرح ایک ایک کر کے چل بسے۔ خود اگر دو سال کے اور ہو لیے تو اسی کے ہو جائیں گے۔ اتنی طویل عمر عذاب ہے' خصوصاً جب دماغ اسی طرح حسب سابق کام کر رہا ہو۔ جج رفاقت حسین اپنی آنکھوں کے تارے شفق کی مایوسی بے رنگ زندگی اور سب سے بڑے پوتے مجو کی نالائقی دیکھ دیکھ کر بیٹھے کڑھا کرتے اور زیادہ جھنجھلاتے۔ سید شفاعت حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے پہلوٹھی کی اولاد مجو میاں کی عمر اب ماشاء اللہ پچیس برس کی تھی۔ تعلیم سے بے نیاز' سینما کے شوقین' گھس گھس کر تھرڈ ڈویژن میں بی اے کیا۔ ڈنڈے بجاتے پھرے۔ آنجہانی لالہ درگاداس رستوگی کے نمک حلال بیٹے گھنشام داس رستوگی عرف للوجی نے ضلع بریلی میں فیکٹری قائم کی ہے۔ اللہ ان کا بھلا کرے بیچارے آڑے وقت میں کام آئے۔ پرانی وفاداری نبھائی۔ مجو میاں کو بریلی بلا کر اپنے کارخانے میں میکنیکل ٹریننگ دلوا رہے ہیں' وہی ملازمت بھی دے دیں گے۔

مجو کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں حمیدہ وہ 23 کی ہو چکیں۔ بیاہ کا کوئی

بندوبست نہیں۔ خیر ابھی کالج میں پڑھ رہی ہیں..... شجو میاں کب کے ہردوئی سے پاکستان جاکر ناظم آباد کراچی میں رچ بس گئے۔ انہوں نے اپنے ایک لڑکے کا' جو لاہور میں اعلیٰ افسر ہے' حمیدہ کے لیے پیغام بھیجا تھا مگر بیچارے جج صاحب پوتی پر عاشق' اس کی صورت دیکھ کر جیتے ہیں۔ اسے اتنی دور دوسرے ملک بھیجنا گوارا نہ کیا۔ اب تو خیر 65ء کی لڑائی کے بعد وہاں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حمیدہ شکل صورت میں باپ اور دادا پر گئی ہے اور بے حد تیز طرار' خود سر' خود رائے لیکن پڑھنے لکھنے میں وہ بھی پھسنڈی۔ سینما اور سیر سپاٹے کی شوقین۔ ان دنوں کالج کی لڑکیوں کے ساتھ کشمیر گئی ہوئی ہے۔

سید شفاعت حسین نے گھڑی دیکھی۔ لنچ کا وقت قریب تھا۔ کرسی سے اٹھے۔ اتنے میں سیمنٹ کی بوریوں سے لدا ایک ٹرک عین برآمدے کے پاس آکر رکا۔ گرد و غبار کا بادل باپ بیٹوں کو سفید کر گیا۔ جج صاحب نے بڑبڑا کر اخبار سے اپنا سر چھپالیا۔

"ڈیڈی اب اندر چلئے۔"

"دیکھئے..... یہ دیکھ لیجئے۔" جج صاحب اخبار بیٹے کے سامنے کر کے برافروختگی سے بولے "آپ قوم کی حالت سدھارنے کی غرض سے تقریر لکھ رہے ہیں؟ قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اسے آپ کی تقریروں کی پرواہ نہیں..... ملاحظہ کیجئے۔ یہ آپ کے احباب ڈوم دھاڑیوں کے ساتھ فخر سے دانت نکوسے کھڑے ہیں' استغفر اللہ....."

شف نے اخبار میں چھپی تصویر پر نظر ڈالی۔ شہر کے ایک عصرانے میں بمبئی سے آئے ہوئے تین نامور فلم سٹار چند صوبائی وزراء کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"ڈیڈ..... یہاں بہت دھول اڑ رہی ہے۔ اندر چل کر آرام کیجئے۔" شفاعت حسین نے نرمی سے کہا۔

"چلے جائیں گے۔" جج صاحب نے جھلا کر جواب دیا۔ "اب آرام ہی

آرام ہے۔ خدا کرے جلد قبرستان پہنچ کر اپنی گور میں آرام کریں۔"

شفاعت حسین نے فکر سے باپ کو دیکھا۔ چراغ سحری ہیں۔ جانے کب تک ان کا سایہ سر پر رہتا ہے' سہارا دے کر انہیں آرام کرسی سے اٹھایا۔

"اچانک جج صاحب نے پوچھا۔ حمیدہ کی خیریت کا خط آ گیا؟"

"جی ہاں ڈیڈی کل ہی تو آیا تھا۔ آپ کو سنا دیا تھا۔"

"ہوں...... کب تک واپس آئے گی؟"

"کالج کی ٹیم کے ساتھ گئی ہے۔ کشمیر جیسا مقام' ایک مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔"

جج صاحب نے مرتعش ہاتھوں سے بیٹے کا بازو تھاما۔ "حمیدہ کو واپس بلالو۔ اسے خط لکھو کو جلد واپس آ جائے۔"

"بہت اچھا ڈیڈی۔"

شفاعت حسین احتیاط سے چلاتے ان کی خواب گاہ میں لے گئے۔ تخت پر بیگم رفاقت حسین مخمل کے ہلکے گلابی دوپٹے سے منہ لپیٹے بے خبر سو رہی تھیں۔ بیٹے نے جج صاحب کو احتیاط سے مسہری پر لٹایا۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پرانے بدرنگ پردے برابر کیئے اور باہر آئے۔ بیوی حسب معمول باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ چھوٹے بچے سب سکول گئے تھے۔ کوٹھی پر وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔

شفاعت حسین اپنے کمرے میں گئے۔ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے۔ دوسرا قلم تلاش کیا دراز میں سے دبیز نیلے کاغذ کا رائٹنگ پیڈ نکالا' جس کی پیشانی پر مرحوم تعلقے کا طغرا ثبت تھا۔ اس آخری پیڈ میں اب تھوڑے سے کاغذ باقی رہ گئے تھے۔ ٹورسٹ ہوٹل گلمرگ کے پتے پر بیٹی کو انگریزی میں خط لکھنا شروع کیا...... "میری پیاری بیٹی حمیدہ...... میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنی چھٹیوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو گی...... لیکن بیٹی تمہارے گرینڈپا تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔ جلد از جلد واپس آ جاؤ۔"

9۔ دلربا

اردو کے مقبول اور کثیر الاشاعت فلمی ماہنامے "فانوس" کے "سیاح" کی ڈائری سے ایک اقتباس:

"فلمستان سے نکل کر سیاح اپنی کار میں بیٹھا۔ بہت دیر ہوئی تھی۔ لیکن سیاح نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج دلربا کا انٹرویو ضرور حاصل کرے گا۔ چنانچہ اپنی کار میں گلزار بانو کی عالیشان کوٹھی گلستان پر پہنچا۔ گلستان پر ان دنوں بہار آئی ہوئی ہے۔ گلاب کے پھولوں سے باغ لہلہا رہا تھا۔ روشوں پر ولایتی کتے کھیلتے پھر رہے تھے۔ اندر برساتی میں امپالا اور مرسیڈیز گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پھاٹک پر ہی گورکھے نے سیاح کو بتایا کہ میم صاحب ابھی شوٹنگ سے واپس نہیں آئی ہیں۔ لہٰذا وہاں سے گلنار سٹوڈیوز کا رخ کیا۔

"فانوس کے پتنگوں کو سب سے پہلے سیاح ہی نے یہ اطلاع دی تھی کہ گلرو پکچرز کی تازہ فلم میں نئی دریافت دلربا کام کر رہی ہے۔ جب سیاح سٹوڈیوز کے گیٹ کے اندر پہنچا تو بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ فلور نمبر 3 پر شوٹنگ چل رہی تھی۔ سیاح نے اپنا کارڈ میڈم گلنار کو بھیجا۔ انہوں نے فوراً اندر بلوا لیا۔ وہ اپنے خوبصورت ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھی' اپنے چھوٹے بھائی کتھک استاد منو صاحب سے باتیں کر رہی تھیں۔ وسیع و عریض بلوری میز کے پیچھے دیوار پر ان کی والدہ بائی گلزار بائی مرحومہ کا بڑا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ گلنار بانو کچھ بدلی بدلی سی نظر آئیں۔ پچھلی مرتبہ جب ان کو دیکھا تھا ان کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ آج نیلے۔ سیاح کا استعجاب دیکھ کر مادام ہنس پڑیں اور بتایا کہ چند ماہ قبل اپنے منجھلے نواسے سے ملنے امریکہ گئی تھیں' وہاں اپنی امریکن بہو کے اصرار پر بال نیلگوں کروا لیے۔ گلنار بانو نے سیاح کو بتایا کہ مغرب میں "گولڈن ایج" والی خواتین اکثر اپنے بال نیلے یا کاسنی رنگوا لیتی ہیں اور بہت ELEGANT معلوم ہوتی ہیں۔

"گلنار بانو کی گفتگو ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ کہنے لگیں' اس دفعہ

لندن میں مارلین ڈیٹریخ کا نائٹ کلب شو دیکھ کر میں نے سوچا اے ہے۔ یہ بڑی بی اس سن میں یوں جلوے دکھا رہی ہیں میں نے تو سیانی لومڑی کی طرح فقط بال ہی نیلے رنگوائے!

"سیاح نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ مادام نے مزید بتایا کہ وہ ہر سال یورپ یا امریکہ جا کر کچھ عرصہ کسی ہیلتھ فارم پر گزارتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک ہے۔ اس وقت بھی سرمئی رنگ کا امریکن ٹراؤزر سوٹ پہنے خفیف سے امریکن لہجے میں انگریزی بولتی مادام گلنار ایک شاندار شخصیت معلوم ہو رہی تھیں۔ سیاح جس غرض سے آیا تھا اسے فراموش کر کے ان سے باتیں کرنے میں محو رہا۔ تب خود گلنار بانو نے کہا آپ بے بی سے ملنا چاہتے ہیں آیئے اس کے ڈریسنگ روم میں چلیں۔

"ڈریسنگ روم میں نئی ہیروئن سے ملاقات ہوئی۔ گلنار بانو نے تعارف کراتے ہوئے سیاح کو بتایا کہ یہ فلمی نام بھی انہوں ہی نے رکھا ہے۔

"دراصل دلربا میڈم گلنار ہی کی دریافت ہے۔ اسی سال ماہ جون میں میڈم اور ان کے بیٹی گلرو بانو اپنی کمپنی کی ایک فلم کی آؤٹ ڈورز کے لیے گلمرگ گئی تھیں۔ یہ لڑکی اپنے کالج کے گروپ کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ ایک روز شوٹنگ دیکھنے آئی۔ گلنار بانو سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اسے فلم میں کام کرنے کی دعوت دی، جو اس نے فوراً قبول کر لی۔

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں اتنی آسانی سے ایک بڑے BANNER کی پکچر میں لے لی گئی۔" دلربا نے سیاح سے کہا۔

"گلنار بانو نے سیاح کو بتایا کہ وہ نصف صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ سے شوبزنس میں ہیں۔ پہلے تھیٹر، پھر خاموش بائی سکوپ، پھر ٹاکی، اب کلر سینما اسکوپ اور پچھلے پندرہ سال سے خود فلم پروڈیوس کر رہی ہیں۔ لیکن دلربا جیسی باصلاحیت اداکارہ انہوں نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔

"دلربا نے شرما کر کہا۔ ممی یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اتنی دیر میں میڈم گلرو بھی کمرے میں آ گئیں۔ ان کے تینوں لڑکوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے سب سے بڑا بیٹا ہالی وڈ میں فلم ڈائریکشن سیکھ کر آیا ہے۔ دلربا کی پکچر وہی ڈائریکٹ کر رہا ہے۔

"دلربا نے انٹرویو کے دوران سیاح کو بتایا کہ وہ شمالی ہند کے ایک معزز اور بے انتہا قدامت پرست گھرانے سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اس اچانک اطلاع پر کہ اس نے کشمیر سے بمبئی جا کر فلم لائن اختیار کر لی' دلربا کے دادا پر فالج کا اثر ہو گیا اور والد کو دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں۔

"میں ان کو دیکھنے گھر جانا چاہتی تھی۔ لیکن انہوں نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ گرینڈ فادر اور ڈیڈی کی علالت کا مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر میں آرٹ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں اور آرٹ کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ اتنے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے آ کر کہا کہ شارٹ تیار ہے اور دلربا سیاح کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئی۔

"گلنار بانو باتوں کے موڈ میں تھیں۔ بتایا کہ دلربا ان کے ساتھ گلستان میں ہی رہتی ہے۔ میں اور گلرو اسے اپنی اولاد کی طرح رکھتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں میری بیٹی گلرو کے ہاں تین لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے۔ میری والدہ مرحومہ اپنی پرنواسی کا جشن ولادت دھوم دھام سے منانے کا ارمان دل میں لیے لیے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے گلرو کو ایک بنی بنائی بیٹی اور مجھے نواسی عطا کی اور اس کارساز حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں' جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔"

🏛🏛🏛🏛🏛🏛
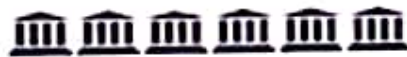
اگلے جنم موہے بیٹانہ کیجیو

لگا کے کاجل چلے گو سائیں...... بھورے قوال کی فلک شگاف تان سے چراغ کی لو بھی تھرا گئی۔ ارے لگا کے کاجل چلے گو سئیاں...... بھورے خاں کے دس سالہ صاحبزادے شدو اپنی باریک آواز میں نغمہ سرا ہوئے۔ اے لگا کے کاجل چلے گو سئیاں...... چاروں فاقہ زدہ ساتھی تالیاں بجا بجا کر دہرانے لگے۔ بھورے خاں ہارمونیم پر سر نیہوڑے تیز تیز انگلیاں چلایا کیے۔ پھر سر اٹھا کر اوپر روشن آسمان کو دیکھا جس پر بارہویں شب کا چاند جگمگا رہا تھا۔ آسمان صحرائے شام کا وہ سیاہ پوش راہب ہے جو اپنی خانقاہ کی محراب میں قندیل جلائے رکھتا ہے لیکن مسافروں کو راستہ نہیں ملتا۔

چلے گو سائیں...... چلے ...... شب معراج کا بیان۔ اور بھورے خاں کا لاثانی فن...... ہنڈے شاہ کا بارونق عرس۔ سامعین تھے کہ مبہوت بیٹھے تھے۔ ایک آدمی قوال پارٹی کے سامنے دھری تیل کی ڈبیا کی لو اکسانے میں منہمک ہو گیا کیونکہ درگاہ میں آویزاں گیس کا ہنڈہ مدھم پڑ چکا تھا۔ اسی زنگ آلود پیٹرومیکس کی وجہ سے وہ بزرگ ہنڈے شاہ کہلاتے تھے۔ وہ اپنے معتقدین کے مانند ایک

مسکین، غیر معروف بزرگ تھے۔ جانے تھے بھی کہ نہیں۔ یہ سب جو ہو رہا ہے یا نہیں یا اس کی اصل اور بنیاد کیا ہے۔ ہنڈے شاہ غیر موجود ہیں تو موجود کیا ہے اور جو کچھ ہے بس یہی ہے تو غیر موجود کیا ہے اور جو ہے اس کا جواز بھی کوئی بتلائے۔ مزید بر آں فن کاروں، ادیبوں، شاعروں کی طرح اولیاء بھی اس لحاظ سے بعضے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا جانتی ہے۔ بعضوں کو چند اللہ کے بندے ہی چراغ جلانے کے لیے میسر آتے ہیں۔ بعضوں کو وہ بھی نہیں۔

پیر ہنڈے شاہ کے غریبانہ عرس میں آنے والے تیلی، جولاہے کنجڑے، قصائی، بھڑ بھونجے، کاشتکار، کھیت مزدور، جھونپڑوں میں زندگیاں گزار کر کچی قبروں میں دفن ہوئے۔ خدا کے مقبول بندے وہی ہیں جیسے وہ بوڑھی شریفن...... بیوہ، لاوارث، مفلس، ان پڑھ۔ جو درگاہ کے پیچھے چبوترے پر نماز عشاء پڑھ رہی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... اللہ اکبر...... پڑھتی ہوں کلمہ اللہ محمد کا...... لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... اللہ اکبر...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... قیام...... رکوع...... قومہ...... سجدہ...... قعدہ...... رکوع...... قومہ...... سجدہ...... قعدہ۔ اس عورت نے جسے نماز پڑھنا نہیں آتی، ساری عمر جب بھی کمر توڑ محنت مزدوری سے مہلت پائی اپنے رب کو اسی طرح یاد کیا۔ اس کی اکلوتی، جوان معصوم مظلوم لڑکی کو اس کے سسرال والوں نے گنڈاسے مار کر ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کو کھلا پلا کر مزے سے دندناتے ہیں۔ شریفن گھر گھر جا کر چکی پیستی ہے اور چار آنے روز کماتی ہے۔ سب سے پہلے جنت میں وہی جائے گی۔

اور یہ گمنام بے بضاعت دیہاتی قوال اور یہ ان کے سامعین۔ غیر اہم...... حقیر...... عسرت زدہ...... صابر و شاکر اور عرس کے میلے کے یہ دکاندار...... چگی داڑھیوں والے تہمد پوش، میلے دوپٹوں، چاندی کی بالیوں اور پیوند لگے گھٹنوں والی جوان اور بوڑھی عورتیں جو اپنے سامنے ٹاٹ بچھائے بیٹھی ہیں اور ان پر تھوڑی کھجوریں، مونگ پھلی کی ذرا ذرا سی ڈھیریاں، ریوڑی،

بتاشے 'اندر سے 'گڑ کی بھلیاں دھری ہیں اور ایک ایک ٹین کی ڈبیا ٹمٹما رہی ہے۔
یقین جانو اور ایمان لے آؤ کہ اہلِ بہشت یہی لوگ ہیں۔

ایک سفید ریش بڑے میاں "ہر مال ملے گا چار آنے" کی صدا لگا رہے ہیں۔ ان کی دکان فیتوں کے ٹکے بندے 'کلپ' ہاروں اور نقلی گھڑیوں پر مشتمل ہے۔ میلے والیاں ہیں کہ اس ڈیپارٹمنٹ اسٹور پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔

"یہ کلپ کیا بھاؤ دیا...... "ایک نو عمر لڑکی جارجٹ کا بوسیدہ سبز دوپٹہ سر سے لپیٹ کر اکڑوں بیٹھ جاتی ہے۔

"ہر مال ملے گا لا چار آنے...... بٹیا۔"

لڑکی دوپٹے کے کونے کی گرہ کھول کر چونی نکالتی ہے۔ پھر ایک بار کو للچائی نظروں سے دیکھتی ہے۔ انٹی میں فقط چار آنے باقی ہیں۔ ابھی جمیلن کے لیے بھی کچھ خریدنا ہے۔

"اچھا ایک کلپ اور دے دو...... وہ لال والا۔ ہماری چھوٹی بہن کے لیے......" لڑکی نے زرد "کیلے" کی قمیص اور نیلے ساٹن کی شلوار پہن رکھی تھی۔ کلائیوں میں ہری "ریشمین" چوڑیاں۔

"رشک قمر...... او! رشک قمر......" بھیڑ میں سے آواز آتی ہے۔

"جانو تمہری مہتاری گبراوت ہیں۔" ایک عورت ٹہوکا دے کر اس سے کہتی ہے۔ وہ درگاہ کی طرف بھاگتی ہے جہاں بھورے خاں کا پروگرام ختم ہو چکا ہے۔ اب "امرتی جلیبی" اور "کانڑے بھانڈ" کا نمبر ہے۔

لڑکی دوڑتی ہوئی چبوترے کی سمت آتی ہے۔ جہاں ایک ایک چشم مسخرہ پھندنے کی ترکی ٹوپی اور سرخ واسکٹ اور سلیپنگ سوٹ کا نیلا دھاری دار پاجامہ پہنے ایک مختصر سا ہارمونیم سنبھال چکا ہے۔ ایک مدقوق عورت دھنتر شال میں لپٹی ڈھولک اپنے آگے سرکاتی ہے۔ ایک کمسن بچی قریب بیٹھی مجمع کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ مدقوق عورت اسے ایک تھپڑ رسید کرتی ہے۔ "اری بدذات' ادھر کیا بیٹھی ہے تھوا کی تھوا۔ سامنے آ کر بیٹھ۔"

"خالہ ہمیں اٹھاؤ تو"...... بچی نرمی سے کہتی ہے۔

"سات فاقوں پر بھی وزن ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مرنے جوگی کا......" مدقوق عورت بڑبڑاتی ہے۔ اتنی دیر میں نیلی شلوار' ہرے دوپٹے والی لڑکی چبوترے پر پہنچ جاتی ہے۔

"بجیا......" بچی اس کی طرف باہیں پھیلاتی ہے۔ بڑی لڑکی اسے گود میں اٹھا کر ہارمونیم کے سامنے بٹھال دیتی ہے۔ بچی اپنی خشک ٹہنی ایسی ٹانگ کو احتیاط سے اپنے منے سے غرارے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اب یک چشم مسخرہ سر ترچھا کر کے ہارمونیم پر تیز تیز انگلیاں چلاتا ہے۔ بڑی لڑکی کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگاتی ہے۔

"چلو...... چلو امرتی جلیبی گاوت ہیں۔" مجمع میں بھنبھناہٹ۔

بڑی لڑکی نے گانا شروع کر دیا ہے۔ "سفر ہے دشوار...... سفر ہے دشوار...... خواب کب تک...... بہت بڑی منزل عدم ہے۔"

لنگڑی بچی مصرع ثانی اٹھاتی ہے...... "نسیم جاگو...... نسیم جاگو...... کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے......" سامعین سر ہلا ہلا کر جھوم رہے ہیں۔

"جوانی و حسن' جاہ و دولت' یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے......" اپاہج بچی بڑی محنت سے بڑی بہن کا ساتھ دیتی ہے......

"اجل ہے استادہ دست بستہ' نوید رخصت ہر ایک دم ہے...... بسان دست سوال سائل تہی ہوں ہر ایک مدعا سے......" بڑی لڑکی شین قاف سے درست' نہایت سلیقے سے گا رہی ہے۔

"...... نیاز ہے بے نیازیوں سے' بغل میں دل صورت صنم ہے۔"

"حق اللہ......" ایک کالا بھجنگ ملنگ نعرہ لگا کر فرش پر لوٹنے لگتا ہے۔

"اللہ ہو' اللہ ہو...... اللہ ہو...... اللہ......"

"مآل کار جہان فانی کبھی نہیں ایک قاعدے پہ...... جو چار دن ہے وفور راحت تو بعد اس کے غم و الم ہے......"

گاؤں کے چودھری حامد علی کے چچازاد بھائی جو مقدمے بازی میں لٹ پٹ چکے ہیں زور زور سے فرش پر ہاتھ مارتے اور روتے ہیں اور چلّا چلّا کر دہرا رہے ہیں۔ "جو چار دن ہے...... جو چار دن ہے...... واہ رے اللہ...... واہ...... واہ رے مولا واہ...... دیکھ لی تیری قدرت...... دیکھ لی......"

"زبان رو کو بہک رہے ہو، سرور دوشینہ جوش پر ہے......" بڑی لڑکی ان کو مخاطب کر کے گاتی ہے...... اب چند لوگوں کا حال آ رہا ہے...... جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔ معذور بچی کو یک چشم مسخرے نے اپنے کاندھے پر بٹھالیا ہے۔ وہ اپنے منے منے ہاتھوں سے تال دے کر بہن کی ہمنوائی میں مصروف ہے...... "نعان رو کو بہک رہے ہو...... سرور دوشینہ جوش پر ہے......"

"یہ مصرع بجز مصیبت پسند ہم کو کمال آیا...... نسیم جاگو...... کمر کو باندھو...... اٹھاؤ بستر...... کہ رات کم ہے......"

غربت زدہ سامعین اکنیاں دونیاں مدقوق عورت کی طرف پھینکتے ہیں جو وہ اپنا دوپٹہ پھیلا کر اس میں سمیٹتی جارہی ہے۔

"کھسکے ڈبل...... کھسکے ڈبل...... کھسکے ڈبل۔" بڑی لڑکی رشک قمر عرف قمرن عرف امرتی ٹھمکی لگاتی گاؤں کے سفید پوشوں کی طرف جاتی ہے جو اسے چونی اٹھنی دیتے ہیں۔ سب ملا کر ساڑھے نو روپے بنے۔ رشک قمر مایوسی سے پیسوں پر نظر ڈال کر ان کو دوپٹے کی گرہ میں باندھ لیتی ہے۔

مجمع چھٹنے لگتا ہے۔ قمر کا کنبہ اپنا ساز و سامان سمیٹ کر چبوترے سے اترتا ہے۔ وہ درگاہ کے احاطے سے نکل کر نانبائی کی دکان کی طرف جاتے ہیں جہاں ان کا زادِ راہ ایک کونے میں رکھا ہے۔ نانبائی بھی اپنی دکان بڑھانے میں مشغول ہے۔ قمرن ٹین کا چھوٹا سا بکس کھول کر بڑی احتیاط سے اپنے دونوں کلپ اس میں رکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔

"آنسوے کیوں بہاتی ہے کم نصیب۔" مدقوق عورت برقعہ سر پر ڈالتے ہوئے اسے جھڑکتی ہے۔ "جمیلن کو اٹھا۔"

"کھانا تو کھالو......" نانبائی المونیم کے کٹورے میں تھوڑا تھوڑا شوربہ اور چار نان ان کو دیتا ہے۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کے سر جوڑ کر طعام شب تناول کرتے ہیں...... نانبائی ان سے پیسے نہیں لیتا۔ اب یک چشم بھانڈ ریلوے قلی کی سی پھرتی سے ٹرنک اور دری میں لپٹا بستر اپنے سر پر دھرتا ہے۔ ہار مونیم کمر سے لٹکاتا ہے۔ عورت ڈھولکی سنبھالتی ہے۔ قمرن گود میں جمیلن کو اٹھا لیتی ہے۔ تینوں سر جھکائے یکوں کے اڈے کی سمت چل پڑتے ہیں۔ میلے کے بازار میں سے گزرتے ہوئے ننھی جمیلن سر موڑ موڑ کر للچائی نظروں سے چوڑیوں کی دکان کو دیکھتی ہے۔ کانڑا بھانڈ چلتے چلتے ایک لمبا سانس لے کر درگاہ کو مخاطب کرتا ہے...... "واہ پیر ہنڈے شاہ...... بڑی آس مراد لے کر آپ کے دربار میں آئے تھے...... ملا کیا...... نو روپے سوا چھ آنے......"

(2)

فرقان منزل کے زنان خانے میں ڈپٹی صاحب آرام کرسی پر بیٹھے آگے کو جھکے ایک ابرو اٹھا کر سر پر خضاب لگا رہے تھے۔ ڈپٹیائن آئینہ لیے سامنے کھڑی تھیں، ڈپٹی صاحب گنگناتے جا رہے تھے اور محو آرائش جمال تھے۔ دفعتہً انہوں نے کہا۔ "بیوی ہم رشک قمر سے متعہ کر لیں؟"

ڈپٹیائن نے آئینہ اسٹول پر رکھا اور وصلی کی بیٹھی ایڑیوں والی جوتیاں گھسیٹتی چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اندر جا کر مسہری پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر باہر دالان میں جھانکا۔ شوہر عینک کا کیس اور سرفراز اخبار سنبھالے سر جھکائے مردانے کی سمت جا رہے تھے۔

ڈپٹیائن نے چبوترے پر نکل کر آواز دی۔ "چھیدو کی بی بی...... ذرا قمرن کی خالہ کو تو بھیجنا۔"

چھیدو کی بی بی چبوترے کے نیچے سے نمودار ہوئیں اور ڈیوڑھی کی طرف چلیں۔

یہ فرقان منزل ڈپٹی صاحب کے پردادا نے بنوائی تھی جو سنا ہے قندھار

کے گورنر تھے۔ ڈپٹی صاحب کے مخالفین کا قول تھا کہ واجد علی شاہ کے اصطبل میں سائیس تھے اب واللہ اعلم۔ ڈپٹیائن پیٹ بھر کے کنجوس تھیں۔ چبوترے کے نیچے کا تہ خانہ دو دو روپے مہینہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ کرائے دار عورتیں فرقان منزل میں مفت کام کرتیں۔ ان کے لڑکے بالے سودا سلف لاتے۔ مرد فجر کے وقت باہر نکل جاتے' ٹھیلے چلاتے' پتنگیں بناتے یا یوں ہی اوائی توائی پھرتے۔ پھاٹک کے باہر بھی چار کوٹھریاں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں رشک قمر کا کنبہ رہتا تھا۔ کانڑے خالو' سٹرن خالہ' لنگڑی بہن' ہمہ خانہ آفتاب......اللہ توبہ' اللہ توبہ!

چھیدو کی بی بی ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں پہنچیں۔ کوٹھری کے باہر کانڑے خالو کسبت کھولے بیٹھے تھے۔ ایک گاہک ان سے اپنا سر گھٹوا رہا تھا۔ اندر دھواں دھار کوٹھریا میں قمرن کی خالہ ہرمزی بیگم چولہا دھونک رہی تھیں۔ نوجوان جمیلن ایک کھلنگے پر پڑی چھت کی سیاہ کڑیاں گن رہی تھی۔ ایک کھونٹی پر ڈھولکی ٹنگی تھی۔ چھیدو کی بی بی نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ہانک لگائی۔ "اے قمرن کی خالہ! تم کو ڈپٹیائن یاد فرماتی ہیں۔"

"آ گیا ملکن موت کا بلاوا......" ہرمزی بیگم نے پھنکنی پٹخ کر کہا۔ چند منٹ بعد بکتی جھکتی بڑبڑاتی اندر پہنچیں۔ ڈپٹیائن چبوترے پر ان کی منتظر تھیں۔ جا کر متار سی کھڑی ہو گئیں۔

"آؤ بیٹھو......" ڈپٹیائن نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھ گئیں۔

"قمرن کی خالہ......ہم نے تم کو گرہستن سمجھ کر کرائے دار رکھا تھا۔"

"تو کیا ہم گرہستن نہیں ہیں۔" خالہ نے چمک کر کہا۔

"تمہاری لنگڑی بھانجی پر رحم کھایا۔"

"شکریہ عنایت۔"

بہت ہی بد عورت تھی۔

"تم نے ہم سے کہا تمہارا خاوند حجام ہے۔"

"تو کیا گراس کٹ ہے۔"

"ہم سے لوگوں نے آ آ کر کہا' آپ نے کن آفتوں کو گھر میں گھسالیا' گلی گلی گاتے بجاتے' مانگتے کھاتے پھرتے ہیں۔"

"آپ سے تو مانگ کر نہیں کھاتے۔"

ڈپٹیائن تلملا کر رہ گئیں' مگر خالہ سڑن مشہور تھیں۔ انداز گفتگو ہی یہی تھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ اتنے جوتے لگواؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے...... ٹھیک کہتے ہیں کہنے والے کہ حسین آباد کی خانگیوں کا ٹبر ہے۔ ہم نے یقین نہ کیا۔ حضور ﷺ کی حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک خود نہ دیکھو کسی پر شک نہ کرو' لیکن اب ہم نے خود رشک قمر کو برقعہ اوڑھ کر رات برات باہر جاتے دیکھا ہے۔ اب تم یہاں رہنے جوگی نہیں قمرن کی خالہ......"

اماں اور قمرن کی خالہ کے جھگڑے کی آواز سن کر فرہاد میاں اوپر سے اترے۔ آج یونیورسٹی نہیں گئے تھے دیر سے سو کر اٹھے تھے۔ زینہ طے کر کے آنکھیں ملتے چبوترے پر آئے۔ جمائی لے کر دریافت کیا: "امی جان! کیا پھر رشک قمر کا کوئی مقدمہ پیش ہے؟"

"ارے ہم نے کتنی بھلائی کی ان بے گھروں' ناشکروں کے ساتھ۔ رشک قمر کو اسکول میں ڈالا' تمیز سلیقہ سکھایا......" ڈپٹیائن نے فریاد کی۔

"امی جان! آپ اب خاموش رہئے۔ ہم آج سارا تیاپانچہ کیے دیتے ہیں۔ قمرن کی خالہ! آپ تشریف لے جایئے اپنی محل سرا......"

"ارے طعنے نہ دو بھیا۔ خدا کے غضب سے ڈرو۔" خالہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر فرش سے اٹھتے ہوئے کہا اور چبوترے سے اتر کر باہر سٹک لیں۔ فرقان منزل کے شاہ پور آغا صفدر حسین خان قندھاری متعلم ایم۔اے (فارسی) کے کان میں اپنے قبلہ و کعبہ کی رشک قمر میں افلاطونی دلچسپی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ غصے اور

شرم سے بھنائے ہوئے چبوترے کی سیڑھیاں اترے۔ رشک قمر عرف قمرن صحن کے ایک گوشے میں ہینڈ پمپ کے تھڑے پر اکڑوں بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔ ریشمی ململ کا پستئی دوپٹہ نزدیک گل مخمل کے پودوں پر سوکھ رہا تھا۔ تھڑے کی منڈیر پر گیسو دراز ہیئر آئل کی بوتل اور صابن دانی میں لکس سوپ رکھا تھا۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ کہاں سے ہوتے ہیں۔ رشک قمر نے منہ پر چھپکا مار کر سر اٹھایا' اس کی صورت دیکھتے ہی فرہاد میاں کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔

"رشک قمر...... منہ ہاتھ دھو لو تو اوپر ذرا ہمارے کمرے میں آنا۔"

"ڈپٹیائن وہ سامنے ہی بیٹھی ہیں۔" رشک قمر نے ہنس کر جواب دیا۔

فرہاد صاحب جھینپ کر گلابی ہو گئے۔ واقعی خانگیوں کی اولاد ہے۔ بے حیا۔ آوارہ۔ انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "رشکے" ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ یہاں روز تمہاری وجہ سے کوئی نہ کوئی شگوفہ کھل رہا ہے۔ اوپر آؤ بیٹھ کر سوچیں گے تمہارے لیے کیا بندوبست کیا جائے۔"

"بہت اچھا میاں! ابھی آتے ہیں۔ آپ جائیے۔" لڑکی نے اب اسی متانت سے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لک چھپ کر مردانے زینے سے ہوتی' دوسری منزل پر آغا فرہاد کی عملداری میں پہنچ گئیں۔ وہ ایک دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھے دیوان فانی کے ورق گردانی کر رہے تھے۔ دروازہ جس کے نچلے حصے میں سلاخیں لگی تھیں گلی پر کھلتا تھا۔ بڑی سہانی ہوا آ رہی تھی۔

"جی فرمائیے۔" رشک قمر نے کمرے میں آ کر بے باکی سے کہا۔

"قمرن!" فرہاد صاحب نے کتاب کشمیری تپائی پر رکھ کر بات شروع کی۔ "ہم دو سال سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں یہاں آئے دو سال ہو گئے نا؟ پہلے کوئی شکایت تمہارے خلاف سننے میں نہیں آئی۔ جب تک اسکول جاتی رہیں' کشمیری محلے' امن قائم تھا۔ بھلا تم نے اسکول کیوں چھوڑ دیا؟"

"وہاں کے اوپر چند صاحبزادیوں نے اعتراض کیا تھا۔ ہم نے کہا جاؤ جہنم

میں۔ ہم کون سا تمہارے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔"

"رشک قمر بیٹھ جاؤ۔"

وہ قالین پر بیٹھنے لگی۔

"نہیں...... نہیں...... یہاں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آج ہمیں پورا قصہ بتادو۔ یہ تم لوگوں نے کیا مسٹری بنار کھی ہے؟"

"مسٹری کیا......؟"

"راز......"

"ہمارے کیا راز ہوں گے صاحب۔ راز بڑے آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ ہم بہت چھوٹے کمین لوگ ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ...... لیکن امی جان سے محلے والیاں طرح طرح کی باتیں جڑ رہی ہیں۔"

"سب سچ کہتی ہیں۔"

"ہیں؟"

"جی ہاں...... ہم میں یہی تو ایک خوبی ہے میاں کہ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔"

"تم لوگ جب یہاں آئے تو کہا تھا کہ گاؤں میں کاروبار مندا تھا' اس لیے شہر واپس آگئے۔"

"وہ بھی سچ کہا تھا' ہم لوگ گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ خالہ نے کہا' جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے تھک گئے۔ اب شہر واپس چلو۔ یہاں کسی نے بتلایا آپ کے شاگرد پیشے میں کرائے کے لیے کوٹھری خالی ہے۔ یہاں آگئے۔ گانا بجانا البتہ چھوڑ دیا' یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ گھر گھر ریڈیو بج رہا ہے۔ خالو اپنا پرانا کام کرنے لگے نائی کا۔ سارے محلے کی حجامت بناتے ہیں' اس میں کون لمبے چوڑے راز کی بات ہے۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے رشک قمر...... شادی نہیں کرو گی؟"

"شادی......؟"

"کیوں تم کو تعجب کیوں ہوا؟ قاعدہ ہے جب لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں' ان کا بیاہ کر دیا جاتا ہے۔"

"بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں آج کل ماں باپ کے ہاں بیٹھی سوکھ رہی ہیں۔ ہم جیسوں سے بیاہ کوئی عقل کا اندھا ہی کرے گا۔ میاں آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں...... لایئے ہمیں دکھایئے آپ کیا پڑھ رہے تھے۔" اس نے کتاب تپائی سے اٹھائی۔ اس کے ورق پلٹے ایک غزل گنگنانے لگی۔

"ذرا زور سے......"

"دروازے بھیڑ دیجئے' نیچے سب آواز جاتی ہے۔"

فرہاد نے اٹھ کر صحن کی طرف کھلنے والے دروازے بھیڑ دیئے۔ رشک قمر نے ذرا نیچے سروں میں ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ فرہاد میاں مسحور و مبہوت سنا کیے۔ پھر یک لخت کرسی سے اٹھ کر کہا: "رشکے...... ملاؤ ہاتھ...... تمہارا کیریئر سمجھ میں آ گیا۔ ہم تمہیں شاعرہ بنائیں گے۔"

(3)

"آل انڈیا مشاعرہ قیصر باغ کی بارہ دری سے ریلے کیا جا رہا ہے۔ محترمہ صوفیہ نسیم صبیح آبادی مشاعرے کی صدارت فرما رہی ہیں۔ ابھی آپ نے محترمہ نازنین بریلوی سے ان کا کلام سنا۔ اب لکھنؤ کی ہونہار شاعرہ مس رشک قمر سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمایئے۔ آیئے بہن رشک قمر۔"

مشاعرے کے اختتام پر رشک قمر نے اپنا لیڈی ہملٹن کا سیاہ برقعہ اوڑھا اور پچھلے دروازے سے نکل کر گیلری میں پہنچی جہاں آغا فرہاد سیاہ شیروانی سفید پائجامے میں ملبوس اپنی بیاض ہاتھ میں لیے ریڈیو اسٹیشن کے ایک نوجوان افسر سید صاحب کے ساتھ موجود تھے۔ سید صاحب نے ہیڈ فون اتارا۔ ان کے آدمیوں نے اپنا انگڑ کھنگڑ سمیٹنا شروع کیا۔

"رشکِ صاحبہ آپ کے ترنم نے مشاعرہ لوٹ لیا۔" سید صاحب نے مسکرا کر کہا۔ رشک قمر نے نقاب الٹ کر تسلیم عرض کی۔

"اب چپکے سے نکل چلو۔ ورما صاحب نے تمہارے لیے ایک اور پروگرام بنایا ہے۔"

آغا فرہاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ پروگرام کل بتائیں گے۔ اچھا بھائی سید۔ کل تم سے ورما کے ہاں ملاقات ہو گی۔"

آغا فرہاد کے ساتھ باہر آکر رشک قمر تانگے پر سوار ہوئی۔

"تم سے کسی نے سوالات تو نہیں کیے۔ غیر ضروری......" فرہاد نے دریافت کیا۔

"سوالات ہمیشہ غیر ضروری ہوتے ہیں......" رشک قمر نے کہا۔

"لیکن اب آپ کون سا نیا پروگرام سوچ رہے ہیں؟"

"یہ بھی غیر ضروری سوال ہے۔ خاموش رہو اور دیکھتی جاؤ۔ ہم تمہارا کیریئر بنا رہے ہیں۔"

تانگہ پاٹے نالے کے ایک مکان پر جا کر رکا۔ اس کے دروازے پر بھی ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ لیکن یہ مکان فرقان منزل کی اس کوٹھری سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ ڈیوڑھی کے اندر چھوٹا سا آنگن۔ کھپریل کا برآمدہ۔ اندر دو کمرے۔ ڈیوڑھی کے پاس بیت الخلاء۔ دوسری طرف باورچی خانہ۔ امرود کے درخت کے نیچے پانی کا نل۔ رشک قمر کو مشاعروں سے آمدنی ہو رہی تھی۔ ریڈیو پر گانے کے پروگرام مل رہے تھے۔ چھ سات مہینے میں کایا پلٹ گئی۔ خالو اب کسی بڑھیا ہیئر کٹنگ سیلون میں ملازمت کرنا چاہتے تھے مگر ہرمزی خالہ نے منع کر دیا کہ لوگ کہیں گے مس رشک قمر کے خالو نائی ہیں۔ ان کو فرہاد صاحب نے ایک دکان میں جلد سازی کے کام پر لگوا دیا تھا۔

دوسرے روز شام کے پانچ بجے قمرن اور جمیلن برقعے اوڑھ نظر باغ فرہاد صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچیں۔ بالائی منزل کی بالکنی میں میاں فرہاد

انتظار ساغر کھینچ رہے تھے' اشارے سے اوپر بلایا۔ جمیلن کے لیے نئی بیسا کھی آ گئی تھی مگر اسے زینے چڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ فرہاد خود دوڑے ہوئے نیچے گئے۔ اس بے چاری کو سہارا دے کر دوسری منزل پر لائے۔ گیلری میں ایک دروازے پر بورڈ لگا تھا...... نریندر کمار ورما جرنلسٹ (گولڈ میڈلسٹ) رائٹر اینڈ آرٹ ایڈوائزر۔

اندر کمرہ منہ سے بول رہا تھا کہ خالص انٹلکچوئیل کی بیٹھک ہوں۔ دیواروں پر چغتائی کے پرنٹ۔ ایک طرف غالب دوسری طرف ٹیگور۔ کونے میں فلورلیمپ۔ بک شیلف میں انگریزی اردو کتابیں۔ نیچی طویل میز پر اردو کے ترقی پسند جریدے اور چند تازہ بہ تازہ پاکستانی رسالے۔ فرش پر رنگین چٹائی۔ کشتی میں اسٹوڈیو پوٹری کا ٹی سیٹ۔ صاحب خانہ فرش پر بیٹھے' ریڈیو اسٹیشن والے دوست سے مصروف گفتگو تھے۔ ایک دیوان پر ایک نازک اندام گوری سی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی معمولی فالسئی ساری پہنے سہمی بیٹھی تھی۔ نوارد لڑکیوں کو دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ صاحب خانہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ قمرن جمیلن کو بڑے تپاک سے تسلیمات عرض کی اور نوکری نما نہایت آرٹسٹک کرسیوں پر بٹھایا۔ ورما صاحب آغا فرہاد سے عمر میں چند سال بڑے تھے۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک' سر پہ جھوا بھر بھال' کھادی سلک کا بادامی کرتا' نہرو جیکٹ' چوڑی دار پائجامہ' چہرے سے نیک دلی اور خوش خلقی ہویدا تھی۔ دیکھنے سننے میں بھی برے نہیں تھے۔

بیچلر اپارٹمنٹ تھا۔ ملازم چھوکرے کو آواز دی۔ وہ نہیں آیا تو جھنجلا کر چاء دانی اٹھائی اور کچن کی طرف بھاگے۔

''آپ نے اب تک بتایا ہی نہیں صاحب خانہ کون صاحب ہیں۔'' رشک قمر نے چپکے سے پوچھا۔ ریڈیو والے دوست دیوان پر بیٹھے چھریری لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔

''یہ......'' آغا فرہاد نے جواب دیا۔ ''ارے لاجواب آدمی ہیں۔ رئیس

زادے ہیں۔ ماں باپ تر ہی پر رہتے ہیں۔ انہوں نے یہ فلیٹ لے رکھا ہے۔ آرٹ اور کلچر کی خدمت کے واسطے۔ ہم نے تمہارے متعلق انہیں بتایا۔ انہوں نے فوراً ایک اسکیم بناڈالی۔ ابھی دیکھو آکر بتائیں گے۔"

ورماصاحب چاء دانی اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ اب آغا فرہاد نے سرگوشی میں ان سے دریافت کیا...... "یار یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ......؟"

"پہاڑن ہے......"

"یہ ستواں ناک، کنول نین، پتلی کمر...... آپ کو پہاڑن نظر آتی ہے۔"

"سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں ہے۔ خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں......" فرہاد صاحب اکیلے تانگے والوں کی طرح گنگنائے۔

"لاحول ولا قوۃ......" ورماصاحب نے جھنجلا کر کہا اور گوری لڑکی سے مخاطب ہوئے:

"موتی...... ادھر آکر بیٹھو یو...... چاء بنانا سیکھو...... بھئی رشک قمر صاحبہ! ذرا اب آپ ان کی تربیت کیجئے۔"

"لڑکی دیوان سے اتر کر چارپائی پر آبیٹھی اور گھبرائی ہوئی سی سب کے چہرے تکتی رہی۔

"لو...... چاء بناؤ سب کے لیے......" ورماصاحب نے ٹرے اس کے سامنے سرکائی۔

"چوکے میں بیٹھنا چھوڑ میری سرون۔ چھری کانٹے سے کھانا سیکھ ...... لہنگا پہننا چھوڑ میری سرون...... سایہ پہننا سیکھ ...... پیڑھی پر بیٹھنا چھوڑ میری سرون ...... ارے دھولے کنویں پہ تنبورے تانے میخیں دیں گڑوائے...... میخیں دیں گڑوائے......" سید صاحب نے جو دلی والے تھے' الاپنا شروع کیا۔

"یہ کیا ہے؟ کہاں کا لوک گیت ہے؟" ورمانے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک دیہاتن پر دلی کا انگریز ریذیڈنٹ عاشق ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق اس زمانے میں ہماری طرف یہ گیت گایا جاتا تھا......"

"پھر کیا ہوا......؟"

"وہ انگریز قتل ہوا......"

"ولیم فریزر......" آغا فرہاد نے دریافت کیا۔

"ہماری موتی پہ کوئی فرنگی عاشق ہو گیا تو ہم بھی اسے قتل کر دیں گے......" ورما صاحب نے اعلان کیا۔

"صاحب یہ قتل خون کی باتیں نہ کیجئے۔ بد شگونی ہے۔" رشک قمر بولیں۔

"بھائی سنو۔" ورما صاحب نے سینڈوچز سرو کرتے ہوئے فرمایا......

"پچھلے ہفتے ہم گئے تھے علی گنج کے میلے والدہ کو لے کر' وہ بے چاری ہنومان جی کے مندر جا جا کر ہمارے لیے منتیں مانتی ہیں کہ ہم راہ راست پر آ جائیں یعنی اپنا گھر بسائیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ والدہ تو گئیں مندر کے اندر۔ ہم ذرا کیمرہ لے کر نکلے برائے مٹرگشت تو آپ نظر آ گئیں۔ ایک پیڑ کے نیچے کھڑی گجری گا رہی تھیں۔ پوری ٹولی ساتھ تھی۔ قیامت کی آواز ہے۔ بس رشک قمر صاحبہ آپ کے توڑ پر ہیں۔ ہم نے آپ کو ریڈیو پر کئی دفعہ سنا ہے۔"

"تو آپ ان کو پٹا کے یہاں لے آئے۔" رشک قمر نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"بڑی مشکل سے۔ خاص الخاص ضلع فیض آباد کی پاتر ہیں۔"

"اور والدہ کو معلوم ہو گیا تو......؟" آغا فرہاد نے پوچھا۔

"ابھی تو انہیں کچھ علم نہیں ہے۔ ہم کیا کریں۔ بجرنگ بلی کی مرضی یہی تھی۔ اچھا بھئی سنو ہماری اسکیم' ہم ایک سوئنگ برڈز کلب قائم کرتے ہیں۔ آپ تینوں بحیثیت لوک گیت ایکسپرٹ اس کی اسٹارز۔ شہر میں پروگرام کریں گے' ٹور پر جائیں گے' سوئنگ برڈز کلب اڑ جائے گا' ہم آرگنائزر آدمی ہیں بلا

کے ایفی شنٹ کل ہم آرٹ اسکول سے اس کے لیٹر ہیڈ کا نمونہ بھی بنوا لائے۔ دیکھئے......"انہوں نے کافی ٹیبل کے نچلے خانے سے ایک کاغذ نکالا جس کی پیشانی پر لکھا تھا۔ "سونگ برڈز کلب مینجنگ ڈائریکٹر این۔ کے۔ ورما" گوشے میں آم کا درخت' اس پر چڑیاں' نیچے ایک لڑکی بیٹھی طنبورہ بجارہی تھی۔ سب نے باری باری اس کاغذ کو ملاحظہ کیا۔

"جب چڑیاں ہیں تو لڑکی کی کیا ضرورت ہے......" آغا فرہاد نے اعتراض کیا۔

"بھائی آغا صاحب یہ باریکیاں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم جا کے ہینگ بیچو۔ اور سنئے گا۔ ان کا نام۔ موتی ہم نے رکھا ہے صدف آراء بیگم موتی......" ورما صاحب نے لڑکی کو پالتو بلی کی طرح مخاطب کیا۔ "موتی...... کہو صدف۔"

"صد بھ......" لڑکی نے دہرایا۔

"ارے بھئی صدف......ف سے۔"

"صد پھ...... پھ سے......"

"استغفر اللہ۔ کہو صدف آراء بیگم۔

"صد پھ آراء بئگم۔

ورما صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ خیر۔ اللہ مالک ہے۔ کل سے ان کا شین قاف درست کرنے کی Intensive ٹریننگ شروع۔ ڈیڑھ مہینے بعد سونگ برڈز کلب کا پہلا پروگرام ریڈیو پر شیڈول کر لیا گیا ہے...... کیوں میاں؟" انہوں نے سید صاحب سے دریافت کیا۔

"قطعی۔" انہوں نے پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اب ورما صاحب جمیلن کی طرف متوجہ ہوئے جو اس دوران میں چپکی بیٹھی غور سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔ ورما صاحب نے اسے بڑے دھیان سے دیکھا۔ پھر دفعتہً چٹکی بجا کر بولے...... "کماری جل بالا لہری......"

"کون......؟ ہم......؟ ہمارا نام جمیل النساء بیگم ہے۔" جمیلن نے بگڑ

کر کہا۔

"کماری جل بالا لہری۔" ورما صاحب نے قطعیت کے ساتھ دہرایا۔

"شکل میں بالکل بنگالی ملاحت ع آپ بنگال سے کل آئی ہیں...... جل بالا لہری......"

"یہ جلابلا کون بلا ہے؟اور بنگال سے آئے ہماری بلا۔ ہم حسین آباد میں پیدا ہوئے تھے'اب پاٹے نالے پر رہتے ہیں۔"

"ارے بھائی......ہم تمہارا کیریئر بنارہے ہیں۔"

"کریر نہ سریر......وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا مستقبل۔"

"ارے ہمارا کریر اللہ میاں نہ بناپائے'آپ کیا بنائیں گے۔"جمیلن نے خشکی سے جواب دیا۔

"نعوذ باللہ......کیا کفر بکتی ہو۔"ورما صاحب نے برا مان کر کہا۔

"جل بالالہری......"آغا فرہاد نے توصیفاً دہرایا......خوب نام سوچا۔"

"لہری کیوں......؟اس لیے کہ ہم لہرا کر چلتے ہیں؟" جمیلن نے سوال کیا۔

"ارے بھائی ذرااس الٹی کھوپڑی کی لڑکی کو سمجھاؤ۔"ورما صاحب نے عاجز آ کر کہا:"لہری ایک بنگالی Surname ہے۔"

"ورما صاحب ہم انہیں سمجھالیں گے۔اب آپ بتایئے۔ریہرسلیں کب شروع کریں گے؟"رشک قمر نے دریافت کیا۔

ورما صاحب پیڈ پر لکھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

سوئنگ برڈز کلب

1- صدف آراء بیگم۔

2- مس رشک قمر۔

3- کماری جل بالا لہری۔

(4)

"ہیلو...... ہیلو...... جی ہاں۔ میں ورما بول رہا ہوں۔ آخاہ آداب عرض۔ مزاج عالی...... ارے صاحب آپ کہاں تھے۔ دلی سے کب آئے؟ آپ نے ہمارا کونسرٹ Miss کر دیا۔ جی ہاں بہت شاندار رہا۔ ایک منسٹر نے اودگھاٹن کیا۔ خوب تصویریں کھینچیں۔ زبردست پبلسٹی رہی اور ہاؤس فل جی......؟ جی نہیں۔ صرف لائٹ میوزک۔ ہماری آرٹسٹ لوگ غزل اور گیت کی ایکسپرٹ ہیں۔ پریس نے بہت عمدہ ریویو کیے۔ اس وقت......؟ بھئی معاف فرمائیے گا۔ بات یہ ہے کہ آج منگل کی شام ہے۔ والدہ صاحبہ کو ایک کیرتن میں لے جانا ہے۔ آج تو تشریف نہ لائیے۔ ہم اسی وقت نرہی جا رہے ہیں اپنے مکان پر...... جی ہاں جی ہاں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں تو اگلے اتوار کو...... بہت خوب۔ آداب عرض۔" ورما صاحب نے فون کا ریسیور واپس رکھ کر ایک گہری سانس بھری۔ آ کر دیوان پر گر گئے اور فرمایا: "مائیں ہی آڑے وقت پر کام آتی ہیں۔"

"اماں کیوں اتنا سفید جھوٹ بولتے ہو۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کہنے لگے والدہ صاحبہ کو کیرتن میں لے جانا ہے۔" فرہاد نے چٹائی پر لیٹے لیٹے کہا۔ "کون تھا؟"

"ایک مہابور۔ پروگرام کی کامیابی کی داد دینے آ رہے تھے۔ ہم نے ٹال دیا۔" "ارے بھائی صدف آراء......" ورما صاحب نے آواز دی۔

"صدف آراء کچن میں کچالو بنا رہی ہیں۔" رشک قمر نے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھی ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"صدف آراء نے آج تم لوگوں کے لیے بڑھیا کھانا بنایا ہے۔" ورما صاحب بولے۔

"بہت بھلی لڑکی ہے۔" قمرن نے کہا۔

ورما صاحب اچانک جوش میں آ کر اٹھ بیٹھے۔ "تم تینوں بہت بھلی

لڑکیاں ہو...... سنو رشک قمر ہم نے ایک اور اسکیم بنائی ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔"

"بات سنو۔ ہم ایک اردو رسالہ نکالیں گے۔ کل ہی جا کر ڈیکلیئر یشن داخل کرتے ہیں۔ اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ گوہر شب چراغ۔"

"سبحان اللہ۔" فرہاد نے کہا۔ "صدف آراء بیگم اور گوہر شب چراغ۔ آپ کا جواب نہیں۔"

"اور پہلے شمارے میں ایک مضمون لکھیں گے رشک قمر کے متعلق۔ یہ دیکھو......" انہوں نے کاغذ پر جلدی جلدی کچھ گھسیٹا اور کاغذ رشک قمر کو پیش کیا۔

"ممکن عنوان
رشک قمر کی شاعری
کا نظریۂ فن
کا فلسفۂ حیات
کے ساتھ ایک شام
کے شب و روز......"

آغا فرہاد نے کاغذ لے کر پڑھا اور بولے ...... "یہ آخری عنوان ہمیں پسند آیا۔"

"آپ لوگوں کو ہمارا مذاق اڑاتے شرم تو نہیں آتی۔" رشک قمر نے اداسی سے کہا۔

"مذاق......؟ کمال کرتی ہو...... ہم تمہارا ادبی کیریئر بنا رہے ہیں......" ورما صاحب نے سنجیدگی سے ارشاد کیا۔

جمیلن صوفے پر لیٹی تھی۔ بیساکھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔ ورما صاحب اور آغا فرہاد دونوں ان کی مدد کے لیے لپکے۔ اچانک جمیلن سر جھکا کر رونے لگی۔

"جلی من...... جمیلن...... کیا ہوا؟" ورما صاحب نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ورما صاحب۔" جمیلن نے کشمیری سلک کی ساری کے پلو سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ابھی ابھی یہ خیال آیا...... کہ......"

"کیا......؟...... کا......؟"

"...... کہ ہم نے زندگی میں کبھی سکھ چین دیکھا ہی نہیں۔ اب جو اچانک یہ ہمارا ماحول بدلا ہے۔ اس میں بھی کوئی دھوکہ نہ ہو...... بجیا تو سخت جان ہیں' ہم نہیں ہیں......"

"کیسی باتیں کرتی ہو بھائی جلی من...... جمیلن......" ورما صاحب نے انتہائی خلوص کے ساتھ کہا۔

"ارے آپ لوگ ہماری رام کہانی سنیں تو یقین نہ آئے گا۔" رشک قمر کافی بناتے ہوئے بولیں۔ "لیکن ہمیں ہمدردی وصول کرنے سے نفرت ہے اور شرم بھی آتی ہے۔"

"ہمیں نہیں آتی شرم۔ جب قدرت کو ہماری یہ دھجا بناتے شرم نہ آئی تو ہمیں کیوں آئے۔" جمیلن نے رومال سے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ورما صاحب نے کافی کی پیالی پیش کی۔

"ہم پیدا ہوئے اماں ہماری پیدائش ہی میں مر گئیں۔" جمیلن نے کافی کا گھونٹ بھر کے کہا۔ ہم لنگڑے پیدا ہوئے۔ خالہ نے پالا۔ گلیوں میں رل کے لوٹ پیٹ کر پانچ چھ سال کے ہوئے اماں کے مرنے کے بعد گھر کا خرچ چلانے والی صرف خالہ رہ گئیں۔ ان کو ہو گئی تپ دق۔ اماں جو کچھ جوڑ جکوڑ گئی تھی وہ خالہ کی دوا دارو میں اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ بھوالی جاؤ۔ جو تھوڑا سا پیسہ بچا تھا' اسے لے کر ہرمزی خالہ نے بھوالی جانے کی ٹھانی......"

"اور یہ تمہارے خالو......؟" آغا فرہاد نے بات کاٹی۔

"بتاتے ہیں سنتے جائیے۔ یہ ایک حجام ہمارے عقیقے کے لیے بلائے گئے تھے۔ ان بے چارے کو ہم لوگوں سے ہمدردی ہو گئی۔ کبھی کبھار آ نکلتے۔ پہلے تو

ان سے اپنی چلم بھروانے کی بھی روادار نہیں تھیں، لیکن پردے میں بیٹھتی تھیں۔ بیمار پڑیں تو لوگوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اب دوا علاج کی دوڑ بھاگ کون کرے۔ ہم چھ سال کے تھے، بجیا دس گیارہ سال کی۔ یہ جمن خاں حجام بے چارے باہر کے کام کر دیتے۔ ان کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ بھی محبت اپنائیت کے دو بولوں کے بھوکے تھے۔ کہنے لگے میں تم لوگوں کے ساتھ بھوالی چلوں گا۔ حسین آباد کا مکان بھی کرائے کا تھا۔ ہم لوگ بوریا بستر باندھ کاٹھ گودام روانہ ہوئے۔

"اب یہ نگوڑے یک چشم جمن خاں تھے بڑے عیبی۔ گانجے اور افیم کی لت انہیں، جوا یہ کھیلیں۔ خالہ، ہم اور بجیا زنانہ تھرڈ کلاس میں سوار ہوئے۔ وہ مردانے ڈبے میں جا بیٹھے۔

"مریں کو مارے شاہ مدار۔ سارا پیسہ خالہ نے ان کے حوالے کر دیا تھا کہ حفاظت سے رکھیں گے۔ وہ خود روگی۔ ہم دونوں بچیاں۔ خیر۔ کاٹھ گودام ٹرین پہنچی۔ ہم لوگ اترے تو جمن خاں اپنے ڈبے سے اتر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بولے، رات کو سوتے میں کسی نے جیبٹ کاٹ لی۔ خالہ نے کہرام مچا دیا۔ عیبی، بدذات، بھانڈ، شہدے، کسی مسافر کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھا ہوگا۔ ساری رقم ہار گیا۔ انہوں نے حمائل شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ کسی جیب کترے نے بٹوہ پار کر دیا۔ انہوں نے جوا نہیں کھیلا۔ ہم لوگ اپنی قسمت کو رو پیٹ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ اب کیا کریں جو ناشتہ ساتھ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ خالہ کے پاس دو چار روپے تھے، وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اب کھائیں کہاں سے۔ جمن خاں اپنی کسبت ساتھ لائے تھے۔ دوسرے دن وہ پلیٹ فارم کے سرے پر جا براجے۔ مسافروں کی حجامت بنانے لگے۔ پھر خالہ کی سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ وہ ہارمونیم ڈھولکی بھی ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے ڈھولک بجیا کے آگے سرکا دی۔ بجیا نے گانا شروع کیا۔ مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ تھوڑی سی آمدنی ہوئی۔ نینی تال جانے والے امیر لوگ ہمارا گانا سن کر ادھر آ جاتے۔ روپیہ دو روپیہ دے دیتے۔ ریلوے اسٹیشن پر پڑے کئی دن گزر گئے تو پولیس نے ہنکال دیا۔ نزدیک لکڑیوں کے ڈھیر

لگے ہوئے تھے۔ایک سائبان تھا۔اس میں جا بیٹھے۔

"کاٹھ گودام بھی آدھا نینی تال سمجھو۔ خالہ کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ ذرا دم آیا تو کسی نے جمن خاں سے کہا' آس پاس کے گاؤں میں گا بجا کر کافی کما سکتے ہیں۔ ہم لوگ لاری میں بیٹھ کر ہلدوانی پہنچے۔ پھر وہاں سے اور آگے۔ ترائی کے علاقے میں گھومنے لگے۔ افضل گڑھ 'لال ڈانگ' کالا گڑھ۔ وہاں باگھ بگھیلوں کی کثرت تھی۔ رات کو ہم لوگ کسی جنگل کے راستے سے گزرتے' شیروں کے دہاڑنے کی آواز آتی۔ اکثر خالہ مجھے کوستیں۔ کم بخت کوئی شیر بھی آ کر اسے نہیں کھاتا۔ میں بھی کبھی کبھی دعا مانگتی۔ اللہ میاں کوئی شیر تیندوا بھیج دے جو آ کر مجھے کھا جائے۔ لال ڈانگ میں کوربٹ صاحب کا بنگلہ تھا۔ وہ آدم خوروں کی تلاش میں بندوق اٹھائے جنگل جنگل گھومتا تھا۔

"اس علاقے کی آب و ہوا اتنی اچھی تھی کہ خالہ جو برسوں حسین آباد کے گندے مکان میں محبوس رہی تھی' اچھی ہونے لگی۔ وہ بڑا سر سبز پر فضا علاقہ تھا۔ وہاں کچے راستوں پر اب بھی دو منزلہ شکر میں چلتی تھیں۔ ہم لوگ وہاں کئی برس گھومے۔ افضل گڑھ میں عیسائیوں کا مشن تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اشارتاً ہم سے کہا کہ تم سب عیسائی ہو جاؤ اور ہماری تبلیغی ٹولی میں شامل ہو کر گاؤں گاؤں اسی طرح یسوع مسیح کے بھجن گاؤ تو تمہارا علاج بھی کرا دیں گے۔ اسکول کالج پڑھا بھی دیں گے۔ میں نے خالہ سے کہا' ہو جاؤ عیسائی۔ خدا نہ یہاں ہے نہ وہاں' فرق کیا پڑتا ہے۔ تمہارا اور میرا علاج تو ہو جائے گا۔ بجیا اسکول میں داخل ہو جائیں گی۔ ان کی زندگی بن جائے گی۔ خالہ ہمیشہ کی ہتھ چھٹ۔ انہوں نے مار مار کر ہمیں اتو کر دیا۔ ٹانگ تو غارت ہو گئی' بدبخت ایمان بھی کھونے پر تیار ہے۔ خیر...... ان مشنری عورتوں نے ہمیں اور بجیا کو تھوڑی سی انگریزی پڑھا دی اور ان کا کام سکھلا دیا۔

"جمن خاں ذات کے بھانڈ تھے۔ کہتے تھے ان کے دادا پردادا شاہی کے لکھنؤ میں نامی گرامی بھانڈ تھے۔ زمانہ بدل گیا۔ ان کے فن کے قدردان نہ رہے۔

جمن خاں نے مجبوراً نائی کا کام سیکھ لیا۔ اب بھی ان کو تین چار نقلیں یاد تھیں۔ بیچارے بڑی کوشش سے میلوں ٹھیلوں میں وہی پیش کرتے۔ بجیا اور ہم گاتے۔ خالہ ڈھولک بجاتیں۔ بے چاری خالہ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ گنواروں نے ہمارا نام جمیلن سے جلیبی کر دیا۔ بجیا امرتی کہلاتی تھیں۔ بڑی کٹھن زندگی تھی' لیکن خالہ حسین آباد آنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مقید ہو کر انہیں پھر ٹی بی ہو جائے گی لیکن گاؤں اور قصبوں میں اتنی غربت تھی۔ زمینداروں کی تقریبوں میں دس پانچ روپے ایک آدھ جوڑا کپڑا مل جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے گزر ہو رہی تھی۔ پھر پاکستان بنا۔ سکھ ریفیوجیوں کو بسانے کے لیے جنگل کاٹے گئے۔ اس علاقے میں پنجابی شرنارتھی آباد ہونے لگے۔ وہ ہمارے گانوں اور نقلوں کو کیا سمجھیں۔ ہم لوگوں نے پھر اودھ کا رخ کیا۔

''وہاں ایک قصبے میں ہم لوگ ایک سرائے میں ٹکے تھے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ رمضان کا مہینہ۔ مجھے وہ رات اب تک اتنی صاف یاد ہے۔ 21 رمضان کی شب تھی۔ خالو گاؤں کی مسجد میں تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ میں اور خالہ اور بجیا سرائے کے برآمدے میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ خالو کا قاعدہ تھا کہ مسجد سے سحری کھا کر واپس آتے تھے کیوں کہ وہاں گاؤں والے دینداروں کی بھیجی ہوئی سحری کھانے کو مل جاتی تھی۔ سحری کے بعد بستی کی طرف سے نوحے کی دلدوز آواز سنائی دی...... ابن ملجم نے حیدر کو مارا۔ روزہ دار و قیامت کے دن ہیں...... خالو' بجیا اور میں بھی وہی نوحہ پڑھنے لگے۔ اسی وقت ڈھاٹے باندھے ڈاکو صحن میں آ کودے۔ ایک ڈکیت بجیا کو اٹھا لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ سرائے کے آنگن میں سحری کے لیے جگہ جگہ چولہے جل رہے تھے۔ ہماری چیخیں سن کر سارے مسافر دوڑ پڑے۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا' مگر ہم تینوں دہل کے رہ گئے۔ خالو فجر پڑھ کر مسجد سے لوٹے۔ خالہ نے کہا آج ہی شہر واپس چلو۔ دیہات سے بھر پائے۔ چنانچہ ہم لوگ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں آغا فرہاد کے شاگرد پیشے میں

ایک کوٹھری کرائے کے لیے خالی تھی اس میں آن بسے......"

ورما صاحب اور آغا فرہاد مبہوت بیٹھے سن رہے تھے۔ جمیلن نے قصہ ختم کیا تو چونک پڑے۔ صدف آراء جو رسوئی سے آچکی تھی، کہانی سن کر آنسو بہا رہی تھی۔

"مگر تعجب ہے رشک قمر تم لوگ بھابھر کے علاقے میں پلی بڑھیں اور اردو تمہاری اتنی نفیس ہے۔" ورما صاحب نے کہا۔

"ورما صاحب..... جان صاحب کی ریختی خانگیوں ہی کی زبان تھی......" آغا فرہاد بولے۔

"اور ہرمزی خالہ اور جمن بھانڈ کی تربیت۔" رشک قمر بولی۔ "ہرمزی خالہ سنک گئی ہیں، لیکن اب بھی ان کو درجنوں شعر یاد ہیں۔"

"اوہو..... ہمارا خیال تھا تم لوگ ذات کی میراثن ہو......"

"میراثنیں بے چاریاں شریف ہوتی ہیں۔ پیشہ نہیں کرتیں۔ دراصل ہمیں اور بجیا کو گانے کا بہت شوق تھا، اس لیے خالہ نے ڈھولک منگوا دی تھی۔"

"پردہ نشین خانگیاں گاتی بجاتی نہیں ہیں۔ ہم سے پوچھئے۔ اچھا ایک بات بتاؤ قمرن۔ عورتیں خانگیاں کیوں بن جاتی ہیں؟"

"یہ بھی نہایت غیر ضروری سوال ہے آغا صاحب، گویا آپ تو جانتے ہی نہیں۔" رشک قمر نے اکتا کر جواب دیا۔ "انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت ورافت سب دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بدحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود ہمارے نانا بے حد شریف، بے حد غریب آدمی تھے۔ وہ مر مرا گئے۔ اماں کو انہوں نے جس شریف غریب آدمی سے بیاہ دیا تھا وہ کسی وبا میں چل بسے۔ ہمارے باپ..... ہم ڈیڑھ برس کے تھے۔ اماں سترہ برس کی عمر میں بیوہ ہوئیں۔ بالکل بے سہارا رہ گئیں تو مجبوراً...... ہرمزی خالہ کے میاں کسی فوجداری کے مقدمے میں پھنس گئے تھے۔ وہ پولیس سے چھپنے کے لیے لاپتہ ہوگئے۔ خالہ کے سسرالیوں نے بے چاری کو منحوس کہہ کر گھر

سے ہنکال دیا۔ وہ بھی ناچار اماں کے پاس حسین آباد آ گئیں۔ جمیلن وہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باپ اسی شہر کے بڑے باعزت انسان ہیں۔ انہوں نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی۔"

"افوہ بھائی۔" ورما صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ "صدف آراء سے سنو تو وہ بھی کم ستائی ہوئی نہیں ہے۔ اسے تیرہ برس کی عمر میں اس کی ماں نے ایک جھڑوس زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ وہ تھا SADIST۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ دو سال ہی میں لڑھک گیا۔ یہ گرہستی سے بھاگ کر پھر اپنے گاؤں واپس آ گئی۔

صدف آراء اب زار و قطار رو رہی تھی۔

"کبھی آپ کے پاس وقت ہو تو ہمارے جمن خاں سے ان کی داستان حیات بھی سنئے گا۔ یہ جو آپ لوگ اپنی کتابوں رسالوں میں بڑی اونچی اونچی باتیں لکھتے ہیں سب بھول جائیں گے۔" جمیلن نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

"بھانڈوں کی حالت بہت المناک ہے۔" آغا فرہاد سر ہلا کر بولے۔ "فاقے کر رہے ہیں۔ ہمارے بچپن تک بھانڈ اور ساد تو بچے تقریبوں میں بلائے جاتے ہیں۔ یار ورما! تم کو مصطفیٰ حسین بھانڈ یاد ہیں؟ کیا زبردست فن کار تھے۔"

"دھندلے سے یاد ہیں۔ ہماری بوا کی شادی پر برات کے ساتھ تشریف لائے تھے۔" ورما صاحب نے جواب دیا۔

"ہمیں خوب یاد ہیں اسّی برس کے تھے جب ہم نے دیکھا۔ اس عمر میں بھی کیا ناچتے تھے باکمال رقاص تھے۔ اور بعض مرتبہ بس خاموش کھڑے ہو جاتے تھے، لیکن اس انداز سے کھڑے ہوتے تھے کہ محفل زعفران زار بن جاتی تھی اور وہ ان کی گھوڑا چھوڑنے کی نقل۔ ارے یہ لوگ ویسٹ میں پیدا ہوئے ہوتے تو ساری دنیا انہیں جانتی اور لکھ پتی ہوتے۔"

"جمن خالو مصطفیٰ حسین صاحب سے اچھی طرح واقف تھے۔" رشک قمر نے کہا۔

"اب بتاؤ۔ بے چارے جمن خان کو نائی بننا پڑا۔" ورما صاحب بولے۔

"یہ جو ہماری سوسائٹی میں بے چارے Lowest of the lowly کہلاتے ہیں کبھی ان کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ ہمیں تو شہدوں پر بہت ترس آتا ہے۔ ساری عمر مردے اٹھانا' شادیوں میں نچھاور کے پیسے لوٹنا' عجیب و غریب گالیاں دینا' یہی ان کی زندگی ہے اور یہ اسی طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں......اور گورکن اور مردہ شونیاں......" آغا فرہاد نے کہا۔

"بھائی اب زیادہ ڈیپریس نہ کرو۔" ورما صاحب اداسی سے بولے۔

"اور اب سونگ برڈز کلب......" جمیلن نے اسی تلخ آواز میں کہا۔

(5)

لال باغ کی ایک نئی عمارت کی گیلری میں بورڈ:

دفاتر سونگ برڈز انٹرپرائزز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ مینجنگ ڈائریکٹر: این۔ کے۔ ورما (گراؤنڈ فلور)

سونگ برڈز سکول آف لائٹ میوزک۔ پرنسپل صدف آراء بیگم۔ وائس پرنسپل کماری جل بالا لہری۔ فرسٹ فلور۔

"گوہر شب چراغ۔" اردو کوارٹرلی۔ ڈیوٹیڈ ٹو لائف اینڈ لٹریچر۔ پیٹرن: آغا فرہاد قندھاری۔ اڈیٹر: این۔ کے۔ ورما۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر: مس رشک قمر لکھنوی۔ فرسٹ فلور۔

سونگ برڈز ڈانس اینڈ ڈراما گروپ۔ فرسٹ فلور۔

ریذیڈنس مینجنگ ڈائریکٹر شری این۔ کے ورما۔ سیکنڈ فلور۔

شری این۔ کے۔ ورما اپنی نفیس خواب گاہ میں مسہری پر نیم دراز "گوہر شب چراغ" کا اداریہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ صدف آراء بیگم ایک پتی ورتا استری کے مانند پائینتی بیٹھی ان کے پاؤں داب رہی ہیں۔ سہ پہر کا وقت۔ خدا اپنی جنت میں ہے اور دنیا میں ہر طرح سے خیریت۔

"ورما صاحب......اے ورما صاحب......ہم ای کہت رہن اکی......"

"ہم یہ کہتے تھے کہ......"

"اچھا۔ ہم یہ کہتے تھے کہ اب قمرن کا کا ہویے۔ جمیلن بتاوت رہن مساعروں میں آئے والی ساعرہ لوگ ایجی ٹیسن کر رہی ہیں اکی جس مساعرے میں رسک کمر کو بلایا جہے وہ نہ جئیں۔ ان کا چال چلن خراب ہے......"

"شاعرہ لوگ کا دماغ خراب ہے۔ تاریخ ادب اردو گواہ ہے کہ بہت سی ارباب نشاط صاحب دیوان گزری ہیں اور اہل نظر نے ان کی ہمیشہ قدر کی......"

"کا......؟"

"ارے یار۔ تم تو ہو گدھیا۔ اب بک بک مت کرو ہمیں مضمون لکھنے دو......"

"درما صاحب...... ہم ایک باری ایک سپنا دیکھے رہن...... اکی تم ہم سے بیاہ کر لیہن ہو اور آغا فرہاد رسک کمر سے۔"

"اس رات تم کھانا بہت کھا کر سوئی ہوں گی۔"

"پر کچھ زمانہ انہوں نے آغا فرہاد کے ساتھ اچھا بتالیا۔ مساعروں میں دور دور بلائی گئیں۔ بمبئی گئیں تو بتاوت رہین بہوتے آؤ بھگت ہوئی۔ رائٹر لوگ کے ہاں روز دعوت۔ چاء پانی۔ پھوٹو ہینچے جگہ جگہ گجلیں سنائیں۔ مساعرے ہوئے۔ ہر جگہ فرہاد صاحب اور رسک کمر۔ فرہاد صاحب اور رسک کمر کی دھوم مچا دی۔"

"جی ہاں اور جب صاحبزادے لکھنؤ واپس آئے تو ڈپٹی ڈپٹیائن نے وہ جوتے کاری کی۔ لگائے پچاس اور گنا ایک۔ اس مہینے باندھ بوندھ کر بیاہ کر دیا۔"

"یہی تو گجب بھوا۔"

"کیا غضب ہوا۔ ماں باپ کی طے کی ہوئی لڑکی سے بیاہ نہ کرتے؟"

"ارے تم مرد لوگ ہو بڑے حرامی۔ ہم تو جب جانتے جب فرہاد صاحب ڈنکے کی چوٹ رشک قمر سے دو بول پڑھوا لیتے۔"

"زیادہ ٹرٹر نہ کرو۔"

"تم بھی ہمارے ساتھ یہی کرو گے ہمیں معلوم ہے۔ جہاں تمہاری ماتا کہیں گی اسی کنواری کنیا سپتری راجکماری' سوبھاگیہ لکشمی کے ساتھ سات پھیرے ڈالو گے۔"

"دیکھو صدف ہمارا بھیجا مت کھاؤ۔ جاکر سو رہو۔ بھول گئیں تم کون تھیں کیا سے کیا بنادیا۔ نامور آرٹسٹ۔ اب اور زیادہ اونچے خواب نہ دیکھو۔ بھائی میلوں ٹھیلوں میں گانے والی موتی کو صدف آراء بیگم میں تبدیل کر دیا۔ پھر بھی چاؤں چاؤں۔"

"نام بدلے سے قسمت تھوڑے بدل جات ہے۔ جمیلن کا نام بدلے سے کیا ان کی ریکھا بدل گئی۔ ویسے ہی بڑی جھینک رہی ہیں کھاٹ پر۔ ہم جات کے ہندو۔ تم نے ہمیں بنایا صدف آراء بیگم۔ جمیلن کو کر دیا جل بالا لہری۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ ارے جو بھگوان کے گھر سے لکھوا کر لایا ہے وہی بھوگے گا۔"

"عجیب پاگل عورت ہے۔"

"ارے بھگوان کی بے انصافی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ رشک قمر کے ہاں چار برس میں دو ٹھو لڑکے۔ اور فرہاد صاحب کے ہاں تین تین بیٹیاں۔ بھگوان کا جو کام دیکھو الٹا۔ اتنے زمانے سے سنسار چلاتے چلاتے گڑبڑا گئے ہیں۔ ارے سنو ورما صاحب......"

"کیا ہے یار......" ورما صاحب اونگھ رہے تھے۔

"جب نادر پیدا ہوئے ہم نے قمرن کو سمجھایا تھا...... یہ بڑے ہو جائیں تو آغا فرہاد پر دعویٰ کر دینا۔ اتنی بڑی جائیداد کے مالک ہیں کچھ تو مل جائے گا۔ وہ توبہ تلا کرنے لگیں کہ ایسی بات ہی پھر نہ کہنا۔ اس بے چارے کے مرنے کے بعد فرہاد صاحب نے قمرن کا دوئی سو روپیہ باندھا۔ یہ بھی الٹی بات۔ اب جون آفتاب پیدا بھئے تو ان کا چار سو روپے مہینہ نہیں کرنے کا چاہی؟"

"ارے چغد! آفتاب ان کا لڑکا نہیں ہے۔"

"وہ تو ہم ہو جانت ہیں۔ وہ جون آرٹسٹ پنجاب سے آیا رہا اوکا ہے۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ...... ختم فسانہ ہوئے گیا۔ آغا فرہاد تو ملتے جلتے ہیں نہیں۔ بیوی سے ڈرتے ہیں۔ ہمدردی میں وظیفہ دیتے ہیں۔ تو ہمدردی میں دوسو اور بڑھادیں۔ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی ہے۔ اور قمرن بے چاری کی حالت بہت خراب ہے...... اے ورما صاحب...... سوئے گئیں......"

ورما صاحب اب خراٹے لے رہے تھے۔ صدف آراء بیگم اٹھ کر رسوئی گھر کی طرف جارہی تھیں، جب کال بیل بجی جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ایک لمبا تڑنگا، خوش شکل گورا چٹا اجنبی نیلا سوٹ پہنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اپنا نام بتایا۔ صدف آراء نے اندر جا کر ورما صاحب کو جگایا۔

"اے ورما صاحب...... اٹھو...... وہ آئے ہیں۔ آغا شب دیگ......"

(6)

"بجیا...... بہت بن ٹھن کے چلیں...... آغا شب دیگ نے بلایا ہے؟"

"وہ جمیلن تم صدف کی نقل میں جاہلانہ باتیں نہ کرو۔ ہم آغا شب آویز ہمدانی کے ساتھ آن پکچر دیکھنے جارہے ہیں۔"

"شب آویز نام ہی انوکھا ہے۔"

"خالص ایرانی نام ہے۔ اور ہمدان سے ان کے باپ کلکتے آن بسے تھے۔"

"شکردان، چاءدان، ہمہ دان، معقول۔ بس ذرا یہ خیال رکھنا کہ کہیں یہ بھی چونا نہ لگا جائیں۔ ایرانی ہے۔ حد سے حد متعہ کر کے چھوڑ دے گا۔"

"کالی زبان۔ تھو تھو......"

"نکاح کرے گا......؟"

"ہاں کہہ چکا ہے۔"

"نکاح کے لیے تیار ہے؟" جمیلن خوشی کے مارے اٹھ بیٹھی۔ سرہانے سے کھسک کر پائینتی آگئی جہاں قمرن کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔

"کل شام کہہ رہے تھے یہاں سے جاتے ہی خط لکھیں گے۔ ٹھیک دو

مہینے بعد بلا لیں گے۔"

"کلکتے......؟"

"نہیں ان کی بزنس کئی جگہ پھیلی ہے۔ کراچی' طہران' لندن۔ ابھی تو کراچی جا رہے ہیں۔"

"ورما صاحب ان سے اچھی طرح واقف ہیں؟"

"ورما صاحب ہی کے پاس تو آئے تھے اپنی بزنس کے سلسلے میں۔ صدف مجھ سے ریڈیو اسٹیشن پر ملی۔ کہنے لگی ایک آغا کلکتے سے آیا ہے' بہت امیر ہے اور چھڑا۔ شاید نکاح کر لے۔ موسیقی کا بہت شوقین ہے۔ بے چاری نے دوسرے روز ہی سونگ برڈز کلب کا پروگرام رکھا۔"

"بجیا......ایک بات کہوں۔ ورما صاحب صدف کی اس عادت سے بہت پریشان ہیں کہ وہ تمہیں سونگ برڈز کے ذریعے لوگوں سے ملواتی ہے۔ سونگ برڈز اسی لیے بدنام ہو رہا ہے۔"

"تو آخر میں کیا کروں؟ مر جاؤں؟ مشاعروں کے دعوت نامے آنے بند ہو گئے۔ ریڈیو پروگراموں سے خرچہ چل سکتا ہے؟ دو سو روپلی فرہاد کے ہاں سے آتے ہیں۔ پچاس روپے مہینہ ورما صاحب فرضی میوزک اسکول کی فرضی وائس پرنسپلی کے نام سے تم کو دے رہے ہیں۔ محض ازراہ ہمدردی۔ ڈھائی سو میں گزر ہو سکتی ہے؟ ابھی آفتاب کو اسکول میں ڈالنا ہے۔"

"بجیا...... یہ آغا ہمدانی واقعی تم سے شادی کرنے کو تیار ہے......؟"

"کہہ چکا ہے صاف صاف الفاظ میں۔"

"لگتا ہے تم اس پر عاشق ہو گئی ہو۔ کم بخت خوبصورت تو بہت ہے۔"

"ہاں عاشق تو ہو گئے ہیں۔ آج تک کسی پر عاشق نہیں ہوئے تھے۔ اس پر جان جات ہے اور وہ بھی ہمیں بہت چاہتے ہیں۔"

"مگر وہ تمہیں کراچی یا لندن بلا کر شادی کرے گا۔ یہ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کالی زبان۔ تھو۔ تھو۔ تھو...... تو تو میری خوشی دیکھ کر جلتی ہے......
لنگڑی چڑیل...... پچھل پائی......"

"ازبرائے خدا بجیا......ایسی گھٹیا باتیں تو مت کرو......"

بجیا پرس اٹھا تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ٹاٹ کا پردہ اٹھایا اور باہر نکلیں۔ سائیکل رکشہ میں بیٹھیں۔ رکشا پاٹے نالے سے نکل کر کارلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔

(7)

اورے بدھا تا بنتی کروں توری پیاں پڑوں بارم بار
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو چاہے نرک دیجو ڈار

ڈھولک کی تھاپ پر صدف آراء اور کماری جل بالا لہری کی سریلی آوازیں اور ایک دل دوز پوربی گیت......اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو......ارے اگلے جنم......

سونگ برڈز میوزک اسکول کے کمرے میں ایک لڑکی ٹیپ ریکارڈ چلا رہی تھی۔ صدف اور جمیلن برآمدے میں چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ جمیلن کی بیساکھی سامنے دھری تھی۔ صدف تھالی میں ترکاری کاٹ رہی تھی۔ ورما صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔

"آج پندرہ تاریخ ہے۔ قمرن اب تک کراچی پہنچ گئی ہوں گی۔" صدف نے آلو چھیلتے ہوئے کہا۔

"کیا پتہ۔"جمیلن آہستہ سے بولی۔ کب تک پہنچیں گی۔ ڈھاکا پاسپورٹ سے گئی ہیں۔ کھوکھرا پار کا راستہ سنا ہے بڑا جان جوکھوں کا سفر ہے۔ جوان بیٹی کا ساتھ۔"

"آج کی بات ہے جب ماہ پارہ پیدا ہوئی تھی۔ سولہ برس گزر گئے۔" صدف نے کہا۔

"اب کیا وہ بجیا کو پہچانے گا۔ روپا ہو گئے کیس......صدف ہم تو جانتے

ہیں بعض گیت ہی منحوس ہوتے ہیں۔ یاد ہے بجیا ہر پروگرام میں وہی ایک راجستھانی مانڈ سنایا کرتی تھیں۔ ساون بیتو جائے...... عالیجاہ بیگی آودرے...... عالیجاہ بیگی آودرے...... روپا ملا نہ ساجن ملے روپا ہو گئے کیس...... عالیجاہ بیگی حرامزادے الو کے پٹھے کو نہ واپس آنا تھا نہ آیا...... ارے ایک خط تک نہ لکھا......"

"شروع شروع میں دو چار چٹھیاں تو آئی تھیں......" صدف نے کہا۔

"اس کے بعد گول...... بجیا نے کتنے خط لکھے۔ ہر پتے پر...... کراچی...... طہران...... لندن...... سترہ برس ڈاکیے کی راہ دیکھتے گزار دیئے۔ صبح شام دروازے پر جا کر ڈاک کا انتظار کرتیں۔ ہم سے بار بار پوچھتیں کوئی ڈاک آئی...... کوئی تار آیا۔ سترہ برس...... اتنا بڑا انتظار۔"

"بہت بڑا انتظار......" صدف نے دہرایا۔

"جب ماہ پارہ پیدا ہوئی تھی یاد ہے ورما صاحب نے پھٹ سے اس کا کیا نام تجویز کیا تھا...... ماہ دخت...... کہ ایرانی کی بیٹی ہے اس کا نام ہے ماہ دخت...... اور ایک نام امراپالی رکھا تھا۔ ایک ایرانی نام رکھو۔ ایک ہندوستانی اور جب باپ کے پاس جا کر رہے گی انگلینڈ۔ ایک انگلش نام وہاں رکھ لے گی۔" جمیلن بے پایاں تلخی سے ہنسی۔ "ماہ پارہ اپنے سکول میں لڑکیوں سے کہا کرتی تھی ہمارے ڈیڈی لندن اور کراچی کے بڑے بھاری بزنس مین ہیں۔"

"ورما صاحب کوئی تحفہ اس کے لیے فارن سے لے کر آتے اسے سمجھا دیتے۔ بٹیا امراپالی اسکول میں اپنی دوستوں کو بتانا تمہارے ڈیڈی نے لندن سے بھیجا ہے۔" صدف نے کہا اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے۔

"صدف بجیا کو ڈھونگی پیروں فقیروں کے چکر میں تم ہی نے ڈالا۔"

"ہم کیا کرتے جمیلن۔ قمرن ماہ پارہ کی وجہ سے بالکل خفقانی ہوئی جاتی تھیں۔ ہم سے روز کہتیں۔ ماہ پارہ بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں اسے بھی میری طرح کی زندگی نہ گزارنی پڑے۔ میں چاہتی ہوں اسے کسی نہ کسی طرح اس کے باپ کے سپرد کر دوں۔ جمیلن تو خدا ہی کو نہیں مانتیں ان سے کیا کہوں۔ تم کسی

پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس لے چلو۔۔ یہ تو اب کی بات ہے جب ماہ پارہ تین سال کی تھی تب قمرن ایک شاہ صاحب کے پاس گئی تھیں، ہمیں بھی ساتھ لے گئی تھیں...... ان کی بہت دھوم سنی تھی۔ انہوں نے قمرن سے کہا تمہارے اوپر کسی دشمن نے جادو کر دیا ہے۔ راستے بند کر دیئے ہیں۔ تمہارے بال کہیں پر دفن کیے گئے۔ تین سو روپے دو قبرستان میں چالیس دن عمل کریں گے۔ ہم تو یہ سب سن کر ڈر گئے۔ ہم نے قمرن سے کہا، واپس چلو...... ہم تو آگئے مگر وہ پھر پہنچیں ان کے پاس ان سے مایوس ہوئیں تو دوسرے عاملوں کے پتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود جانے لگیں...... کتنا روپیہ برباد کیا۔ تم سے ڈرتی تھیں۔ تمہیں کیا بتاتیں۔ ہم نے بہت سمجھایا، مگر وہ مانی ہی نہیں۔ بس یہی لگن لگی تھی کہ شب دیگ کا خط آجائے۔ وہ بلا لے۔ بلا کر بیاہ کر لے یا ماہ پارہ کی ذمہ داری سنبھال لے۔ سارے پیر فقیر، نجومی، رمال انہیں یہی آس دیا کیے۔ آج سے اکیسویں دن خط آوے گا۔ آج سے ساتویں رات وہ خواب میں آئیں گے۔ آج سے چالیسویں دن خط آوے گا۔ سنیچر کی ساڑھ ستی ہے۔ وہ ختم ہوگی تو مراد پوری ہوگی...... ارے کتنا سینکڑوں ہزاروں روپیہ کھلا دیا ان ٹھگوں کو...... مگر آس نہ ٹوٹی......"

"اس پیر گردی میں بجیا نے اپنے زیور بھی بیچ ڈالے۔ پورا ایک سیٹ بنوا لیا تھا۔ جڑاؤ...... ایک جوڑ کڑے ٹھوس۔ تمہارے ہی ساتھ جا کر تو بنوائے تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کہیں جاتی ہیں تو گہنے نہیں پہنتیں۔ ہم نے پوچھا کہنے لگیں ماہ پارہ کے لیے بینک کے لاکر میں رکھ دیئے ہیں۔ اب ان کے پاکستان جانے کے بعد خبریں مل رہی ہیں کہ سارے گہنے بیچ کر ایک ٹھگ پیر فلفل شاہ بلیوں والے کو کھلا دیئے۔ وہ برسوں سے ان کے لیے بہت لمبے لمبے عمل کر رہا تھا۔"

"ایک بات ہے جمیلن۔ ان ہی فلفل شاہ نے ان کو کراچی جانے کی رائے دی۔"

"کہاں رہتا ہے۔ میرا بس چلے تو جیل بھجوادوں۔" بخشی کے تالاب پر رہتا تھا۔ اب غائب ہے۔ ہم سے ایک روز قمرن نے آکر بہت خوشی بتایا کہ

فلفل شاہ کہتے ہیں...... لڑکی کو لے کر پاکستان چلی جاؤ۔ ہم نے اس کا زائچہ بنایا ہے۔اس کے ستارے بہت تگڑے ہیں۔ کراچی پہنچتے ہی گوہر مراد حاصل ہو گا۔ محبوب کا سر تمہارے قدموں پہ ہو گا...... اب ہم تو یہ کہتے ہیں جمیلن ہو سکتا ہے کراچی میں شب دیگ سے ملاقات ہو جائے۔ اپنی لڑکی کو دیکھ کر ہی انہیں یاد آجائے اور کچھ نہیں تو ماہ پارہ کے نصیب ہی اچھے نکلیں۔ان کا وہاں بیاہ ہو جائے تو ہم تو دونوں جب سے گئی ہیں' روز دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی بھگوان سن بھی لیتے ہیں۔"

"اچھا...... ؟ تم اپنے لیے اتنی مدتوں سے دعا مانگ رہی ہو' وہ تمہارے بھگوان نے سنی؟"

جمیلن نے پوچھا۔

صدف سر جھکائے ترکاری کاٹتی رہی۔

"ورما صاحب نہیں آئے اب تلک ہم چلیں۔" جمیلن نے اپنی بیساکھی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اپنی پریشانیوں میں گھوم رہے ہیں۔جب سے ان کے باپ مرے ہیں وہ باپ کی بزنس سنبھالیں کہ سونگ برڈز کو دیکھیں۔ کل کہہ رہے تھے اس کو بند ہی کر دیں گے۔"

"پھر تم کہاں جاؤ گی...... ؟ ان کی ماتا جی تو تمہیں قبولنے کے لیے اب تک راضی نہیں ہوئیں۔"

"جہاں ہمارے مقدر میں ہو گا جمیلن ہم وہاں جائیں گے۔"

"ہمیں رکشا تک پہنچا دو صدف...... بجیا اگر کراچی پہنچ گئی ہیں تو وہاں دھکے کھاتی پھر رہی ہوں گی۔اب ہم گھر جا کر ان کے خط کا انتظار شروع کریں گے۔"

(8)

پیاری بجیا تسلیم!

آپ کو یہاں سے گئے ایک سال ہو گیا۔ خیریت سے پہنچنے کا صرف ایک

پوسٹ کارڈ آیا تھااور اس کے چار مہینے بعد ایک اور پوسٹ کارڈ۔ ہم اور خالہ یہاں فکر سے ادھ موئے ہوئے جارہے ہیں۔ از برائے خدا سب مفصل حالات لکھئے۔ شاید آپ نے مکان تبدیل کرلیا ہے۔ ہم آپ کو جتنے خط بھیجتے ہیں جواب نہیں آتا۔ صدف بھی کئی خط لکھ چکی ہیں۔ اب یہاں کے حالات سنئے۔ بڑے افسوس سے اطلاع دیتی ہوں کہ خالو کا بدھ کو انتقال ہو گیا۔ کل مسجد میں سوئم کی قرآن خوانی' فاتحہ خوانی بھی کروادی گئی۔ بجیادوسری بری خبر یہ سناتی ہوں کہ تمہارا لڑکا آفتاب ایک روز مجھ جاگتی کی سونے کی دونوں چوڑیاں جو تم بنوا گئی تھیں' کلائیوں میں سے نوچ کر لے بھاگا۔ میں جنم کی اپاہج' اس کے پیچھے دوڑ بھی نہ سکی۔ خالہ ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ یاد ہے پہلے کہا کرتا تھا فرہاد صاحب کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں گا۔ ان لڑکیوں کو غنڈوں سے اٹھوالوں گا۔ اب تمہارے جانے کے بعد سے دھن سوار تھی کہ بمبئی جا کر ہیرو بنوں گا۔ میری چوڑیاں اڑا کر بمبئی بھاگ گیا۔ سنا ہے وہاں جا تو چھری لیے غنڈہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔

فرہاد صاحب کی نئی کوٹھی بٹلر پیلس کولونی میں بن کر تیار ہو گئی ہے۔ وہ اس میں اٹھ گئے ہیں۔ ان کی بڑی لڑکی جس کی شادی انگلینڈ میں کسی ڈاکٹر سے ہوئی تھی' وہاں پر ہے۔ چھوٹی جو بیاہ کے کراچی گئی تھی شاید تمہاری کبھی اس سے وہاں مڈبھیڑ ہو جائے۔ سنا ہے اس کا شوہر وہاں کروڑپتی ہے۔ منجھلی والی لڑکی آج کل لکھنؤ میں ہے۔ اس کے شوہر نے سیتاپور میں بڑے پیمانے پر فارمنگ شروع کردی ہے۔ فرہاد صاحب نے خالو کے کفن دفن کے لیے پانچ سو روپے بھجوائے تھے جو ملازم پیسے لے کر آیا تھا اس نے یہ سب بتلایا۔

بجیا تمہیں یاد ہے ماہ پارہ کے باپ کے لکھنؤ سے جانے کے چند روز بعد ہم لوگ سب ورما صاحب کے ہاں جمع تھے۔ تم نے کہا تھا پتہ نہیں ہماری ماں' خالہ اور ہم دونوں اتنے بدنصیب کیوں پیدا ہوئے تو میں نے تم سے کہا تھا ذرا دنیا کے اصل بدنصیبوں کو دیکھو۔ جنم کے اندھے۔ ڈھائی فٹ کے بونے بونیاں۔ کبڑی لڑکیاں۔ پیٹ پر یہ بڑے بڑے کوبڑ یا چہرے پر چیچک کے نشان۔ بھینگی۔ کانی۔ اور

دیکھو مردہ شونیاں، بھکارنیں، جیل کاٹنے والی عورتیں۔ فرض کرو تم کسی قتل کے مقدمے میں پھنس جاتیں اور عمر قید ہوتی۔ دنیا میں ہزاروں کیا لاکھوں انسان عمر قید کاٹ رہے ہیں۔ سینکڑوں پھانسی چڑھتے ہیں۔ قتل کیے جاتے ہیں۔ تم اور ہم تو لاکھوں سے بہتر ہیں، اپنے سے بدتر لوگوں پر نظر کرو۔

ورما صاحب تالی بجا کر بولے۔ شاباش جمیلن That's the spirit لیکن اب بجیا ہماری اسپرٹ کا بھی کچھ کچومر نکلتا جا رہا ہے۔ کہاں تک اور کب تک۔

اسی روز، تم اس کم بخت آغا شب دیگ کی روانگی کی وجہ سے بہت اداس بیٹھی تھیں تو ورما صاحب نے تمہیں Cheer up کرنے کے لیے چھیڑا تھا کہ رشک قمر تم گوہر شب چراغ کے لیے ایک افسانہ لکھو۔ افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا۔ آنکھوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا...... تو میں نے چڑ کر کہا تھا، افسانہ لکھیں بجیا کے دشمن اور موئی آنکھیں نہ ہوئیں بالٹیاں ہو گئیں۔ بالٹیوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا۔ سب خوب ہنسے تھے۔ تم بھی ہنس پڑی تھیں۔ پھر ورما صاحب خود ہی کہنے لگے واقعی تم دونوں کی زندگیاں تو ایسی ہیں کہ کوئی گریک ٹریجڈی بھی اس کے مقابلے میں پکنک معلوم ہو۔ میں نے پوچھا، گریک ٹریجڈی کیسی ہوتی ہے۔ تم نے کہا تھا وہی جو ہمارے مقابلے میں پکنک معلوم ہو۔

ورما صاحب بولے۔ "تم لوگ تنہا نہیں ہو۔ ہمارے سماج میں زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں ہمیشہ سے ٹریجک رہی ہیں اور انہیں مزید بے وقوف بنانے کے لیے انہیں ستی ساوتری، وفا کی پتلی، ایثار کی دیوی کے خطاب دے دیے جاتے ہیں اور وہ خوش ہو جاتی ہیں۔"

"نہایت الو کی پٹھیاں ہیں۔" میں نے جل کر کہا تھا۔ کہنے لگے: "لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں روتی ہے کہ جانے کیسا نصیبہ لے کر آئی ہے۔ وداع ہوتی ہے تو ماں پچھاڑیں کھاتی ہے کہ نہ جانے سسرال میں اس پر کیا بیتے گی۔ کبھی تم نے کسی انگریز یا امریکن یا یوروپین لڑکی کو دیکھا یا سنا ہے کہ اس کے بیاہ پر

وہ خود یا اس کے ماں باپ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوں۔ پھر ہماری ہندوستانی عورت بیوہ ہوتی ہے تو دراصل پچھاڑیں اس لیے کھاتی ہے کہ اس کے روٹی کپڑے کا سہارا ختم ہوا۔

مگر بجیا...... ان سب کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔ ورما صاحب نے ہمیشہ اسی طرح بڑی اونچی اونچی باتیں کیں مگر خود صدف سے بیاہ نہ کیا۔ ایسی وفادار عورت۔ جس نے بیس اکیس برس ان کے پاؤں دھو دھو کے پئے، کسی دوسرے پر نظر نہ ڈالی، اسے انہوں نے پچھلے دنوں پرانی جوتی کی طرح اتار پھینکا۔

چنانچہ اب ایک بلکہ دو زوردار خبریں بھی سن لو۔ شری نریندر کمار ورما کو ایک دولت مند گجراتن لیڈی ڈاکٹر نے اغواء کر لیا۔ ولایت سے آئی تھی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس۔ ورما صاحب پر خوب ڈورے ڈالے۔ بہت امیر عورت ہے۔ باپ احمد آباد میں مل اونر ہے۔ ورما صاحب کی سونگ برڈز انٹرپرائز اب تقریباً ٹھپ ہو چکی ہے۔ اپنا خاندانی بزنس وہ گھاٹے سے چلا رہے تھے۔ گوہر شب چراغ بھی بند ہو گیا۔ اس میں بہت روپیہ اتنے برسوں ڈبویا۔ شاید یہی سب سوچ کر ڈاکٹرنی سے شادی کر لی۔ وہ انہیں رخصت کرا کے احمد آباد لے گئی۔ بجیا تم سوچ سکتی ہو صدف کا کیا حال ہو گا۔ بہت برا حال تھا، پھکو پھکو روتی تھی۔ لیکن ورما صاحب نے کچھ روپیہ اس کے نام جمع کر دیا تھا۔ اس نے دو کمروں کا ایک فلیٹ لے لیا۔ اس میں اٹھ گئی۔ یہ کوئی چھ مہینے کی بات ہے، مگر اب جو قصہ سناتی ہوں اس پر سر دھنو۔ ابھی چار مہینے ہوئے لکھنؤ میں ہندوستانی لوک سنگیت پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ مجھے اور صدف کو بھی مدعو کیا گیا۔ کانفرنس والے مجھے کرسی پر بٹھا کر لے گئے۔ میرے اندر اب گانے کی طاقت تو رہی نہیں بس بیٹھی ٹکر ٹکر سب کے منہ دیکھا کی۔ کانفرنس میں فارن کے لوگ بھی آتے تھے۔ ایک اردو ہندی داں امریکن بھی تھا۔ بجیا، وہ امریکن صدف پر لٹو ہو گیا۔ جتنی دیر انہوں نے گایا وہ بالکل الوؤں کی طرح منہ کھولے ان کو تکتا رہا۔ کانفرنس کے بعد

صدف سے بار بار ملا۔ پندرہویں دن ان کو کورٹ میں لے جاکر سول میرج کرلی۔ صدف سے تین چار سال چھوٹا ہی ہوگا۔ (یاد رہے ورما صاحب کہا کرتے تھے' ہماری سروں پر کوئی فرنگی عاشق ہوگیا۔ ہم جاکر اسے قتل کردیں گے!) شادی کے تیسرے دن صدف اسے لے کر ہم سے ملانے لائیں۔ کہنے لگیں یہ ہمیں سیڈی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں "مس سیڈی تھامپسن" کسی انگریز کے مشہور ناول کی ہیروئن ہے۔ میں نے دل میں سوچا یہ ورما صاحب کو بتانے والی بات ہے۔ وہ فنافٹ نام تجویز کرنے کے بہت شوقین تھے۔ مگر ورما صاحب اب کہاں' احمد آباد میں بیٹھے سسرے کا بہی کھاتہ دیکھ رہے ہوں گے۔

آج پندرہ دن ہوتے ہیں بی صدف اپنے میاں کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ چلتے وقت ہم سے لپٹ کر اور تمہیں یاد کرکے دھاروں روئیں۔ پرسوں ان کا پیرس سے ہمارے نام خط بھی آگیا۔

کاش بجیا اسی طرح تمہارے دن بھی پھر جائیں۔

ورما صاحب کا میوزک اسکول بند ہونے سے ہماری وہ پنشن بھی القط جو بے چارے نے اتنے برسوں دی۔ تمہارے جانے کے بعد تو ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ فرہاد صاحب سے ہم ایک پیسے کی مدد نہ لیں گے۔ بجیا اب چلا پھرا بالکل نہیں جاتا۔ پلنگ پر پڑے پڑے پلاسٹک کی ٹوکریاں' سوئٹر بن کر بیچے۔ اب چکن کاڑھنی شروع کر دی ہے۔ ایک ساڑی کے دس روپے' زیادہ کڑھت ہو تو بیس یا پچیس۔ بہت دیدہ ریزی کا کام ہے مگر اب آمدنی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ فاقہ کشی کا وہی زمانہ واپس آگیا جو بچپن اور لڑکپن میں تھا۔ واہ ہماری بھی کیا زندگی رہی۔

بجیا اگر تمہارا کام وہاں نہ بنے تو از برائے خدا واپس آجاؤ۔ خالہ دعا لکھواتی ہیں۔ ماہ پارہ کو بہت بہت پیار۔

تمہاری جمیل النساء

یہ خط مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا کیونکہ 71ء کی انڈو پاک جنگ

شروع ہو چکی تھی۔ بھارت اور مغربی پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

(9)

میری پیاری بہن جمیل النساء ہزاروں دعائیں۔ میں جب سے یہاں آئی ہوں تم کو کئی خط لکھ چکی ہوں۔ ایک کا جواب نہیں آیا۔ تمہارے اور خالہ خالو اور آفتاب بیٹے کے لیے سخت فکر مند ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا اب پھر تاکید ہے آفتاب کو کسی طرح مار پیٹ کر اسکول بھیجتی رہو۔ ورما صاحب سے کہو اس کی فیس معاف کرا دیں اور اسے سمجھائیں کہ وہ پڑھنے میں دل لگائے۔ وہ میرے سامنے ہی حد سے زیادہ آوارہ ہو گیا تھا۔

میں تم کو یہاں کی داستان پوری لکھ چکی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مفصل خط تم کو نہیں ملا از سر نو سارا قصہ بتاتی ہوں مگر تم میری فکر میں کڑھنا نہیں۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کھوکھرا پار کے رستے میں بریلی کے ایک غریب مولوی صاحب اور ان کی بڑھیا کا ساتھ ہو گیا تھا جو اپنے بیٹے کے پاس کراچی جا رہے تھے۔ بڑے نیک لوگ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے تم عورت ذات' جوان جہان بٹی کا ساتھ۔ کراچی میں اکیلی کہاں دھکے کھاؤ گی۔ جب تک کوئی ٹھکانہ نہ بنے ہمارے ساتھ ہی رہو۔ میں نے ان کو یوں بتایا تھا کہ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ وہ چھ ماہ کراچی' چھ ماہ لندن رہتا ہے اور میں نان نفقے کا مطالبہ کرنے پاکستان آئی ہوں۔ یہ سن کر انہیں بہت ہمدردی ہو گئی تھی' کیوں کہ ان کی لڑکی کو بھی اس کے خاوند نے بے قصور طلاق طلاق طلاق کہہ کر دھتا بتائی تھی اور وہ بریلی میں پڑی اپنی جان کو رو رہی تھی۔

بہر حال۔ تو میں ان کے ساتھ لالو کھیت پہنچی جو یہاں غریب مہاجروں کی ایک بستی ہے ان کا بیٹا محمد لطیف خان کسی امریکن کے ہاں موٹر ڈرائیور تھا۔ وہ بھی بہت اچھی طرح پیش آیا' مگر اس کی بیوی ماہ پارہ اور مجھ سے جلنے لگی۔ میں نے

لطیف بھائی سے کہا کہ جلد از جلد مجھے کہیں کھانا پکانے کی نوکری ہی دلوادیں تو میں ان کے گھر سے چلی جاؤں۔ وہ میرے لیے نوکری ڈھونڈنے لگے۔ ہمیں وہاں رہتے دس بارہ دن ہوئے تھے کہ ایک روز لطیف بھائی کی دلہن نے میلاد شریف کیا۔ اس میں میں نے نعتیں اور سلام پڑھا تو بہت تعریف ہوئی اور اکثر مکانوں میں بیویاں میری حالت پر ترس کھا کر دو چار روپے بھی دے دیتیں۔ ایک بار پھر وہ ترائی کے گاؤں میں گھومنے کا زمانہ لوٹ آیا۔ کیا اللہ کی شان ہے۔

ایک روز محفل میلاد میں درود شریف پڑھا جا رہا تھا کہ باہر ایک موٹر آن کر رکی اور اس میں سے کچھ غیر ملکی کیمرے سنبھالے اترے۔ میں سمجھی لطیف بھائی جہاں ملازم ہیں وہ لوگ ہیں۔ باہر گئی۔ وہ یوروپین ٹورسٹ تھے۔ اس وقت عورتیں اندر صحن میں زور زور سے درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ ان لوگوں میں سے ایک نے جس کے لمبے لمبے سرخ بال تھے اور نیچے کو جھکی ہوئی مونچھیں۔ مجھے بلا کر انگریزی میں پوچھا "یہ آل محمڈن کیا ہے؟" پہلے تو میں چکرائی پھر خیال آیا کہ "آل محمد" ان کی سمجھ میں All Mohammaden آیا ہے۔ توبہ توبہ۔ اتنے میں ماہ پارہ آگئی۔ اس نے انگریزی میں سمجھایا کہ ہم لوگوں کی ریلی، جس میٹنگ ہو رہی ہے۔ لال مونچھوں والا ماہ پارہ کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میری لڑکی ہے۔ میں نے کہا "یس۔" اجازت چاہی تصویر کھینچ سکتا ہوں "اسٹنگ پر شین بیوٹی" میں نے سر ہلایا۔ اس نے فوراً کئی تصویریں اتار لیں۔ اب ہمارے گرد بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ لال مونچھوں والے نے اپنا کارڈ ماہ پارہ کو دیا کہ فلاں ہوٹل میں کل صبح دس بجے آئے وہ اور تصویریں کھینچے گا کسی فارن میگزین کے لیے اور اس کا بہت اچھا معاوضہ دے گا۔ ماہ پارہ فوراً راضی ہوگئی۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ لطیف بھائی سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ میں نے ماہ پارہ سے کہا اس سے کہہ دے کل فون کر کے بتا دے گی کہ آ سکتی ہے یا نہیں۔ چند منٹ بعد وہ لوگ چلے گئے۔ شام کو جب لطیف بھائی گھر آئے۔ میں نے ان سے ذکر کیا۔ وہ بریلی کے پٹھان آدمی اور مولوی کے بیٹے ایک دم لال پیلے ہوگئے۔ کہنے لگے یہ لڑکی کا بربادی کی

طرف پہلا قدم ہو گا۔ تمہیں معلوم ہے یہ لوگ فارن رسالوں کے لیے کس قسم کی تصویریں کھینچتے ہیں؟اگر تم کو اپنی اور ماہ پارہ کی عافیت منظور ہے اور یہ بھی چاہتی ہو کہ اپنے خاوند پر نان ونفقے کا دعویٰ کر سکو تو شرافت سے رہو۔ میں نے ایک جاپانی کے ہاں آیا گیری کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہاں چلی جاؤ۔ وہ لوگ کوارٹر بھی دیں گے۔ لڑکی اپوا کے کسی انڈسٹریل ہوم میں کام سیکھ سکتی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھ چکی ہے۔ کسی نرسری اسکول میں ملازمت مل جائے گی۔ میں کوشش کروں گا۔ میں نے اس شریف انسان کی بات مان لی اور ماہ پارہ کو ہوٹل جانے کے لیے سختی سے منع کر دیا۔ مگر وہ صبح سویرے ہی چپکے سے بھاگ گئی اور پھر کبھی لالوکھیت واپس نہ آئی۔

آگے کی داستان بہت لمبی ہے۔ مختصر کرتی ہوں۔ ماہ پارہ کو اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں غیر ملکیوں کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ وہ کہاں رہتی تھی اور کیا کرتی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہت دنوں بعد مجھے جاپانیوں کے ہاں فون کیا' جہاں مجھے لطیف بائی نے آیا کی نوکری دلادی تھی۔ میں نے اپنا نام مونا رکھ لیا۔ کوئی پرانا شناسا دیکھ بھی لے تو مونا آپا کو بھلا کیا پہچانے گا۔ میں نے آغا شب آویز ہمدانی کی تلاش جاری رکھی۔ جگہ جگہ فون کیے معلوم ہوا کہ وہ اب مستقلاً لندن میں رہتے ہیں۔ تو پھر وہاں خط لکھے اور حسب معمول جواب کا انتظار شروع کیا اور حسب معمول محروم رہی۔ ایک روز ماہ پارہ نے بہت مضطرب آواز میں فون کیا کہ فلاں ہوٹل میں کوئی آغا ہمدانی طہران سے آکر ٹھہرے ہیں۔ میں تو ان سے ملنے نہیں جاؤں گی، تم ہو آؤ۔ شاید ڈیڈی ہوں۔ میں نے فوراً اپنی جاپانی میم سے چھٹی لی۔ برسوں بعد سنگار پٹار کر کے اچھی ساری پہن کر دھڑکتے دل سے اس ہوٹل پہنچی۔ ریسیپشن کاؤنٹر پر آغا ہمدانی کے کمرے کا نمبر دریافت کیا۔ میرے حواس باختہ ہو رہے تھے' رنگ فق تھا۔ کاؤنٹر کی لڑکیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ اتفاق سے اسی وقت آغا ہمدانی آگئے۔ وہ شب آویز کے بجائے ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ اب مجھے اتنی انگریزی نہ آئے نہ انہیں اتنی اردو۔ بہر حال میں نے

پوچھا' آغا شب آویز ہمدانی کو جانتے ہیں کیسے ہیں؟ گفت۔ بالے بالے۔ خوبے۔ خوبے۔ لندن میں رہتے ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا۔ ان کی خانم اور میری خالہ شیراز میں ایک ہی دانش گاہ میں دانش جو تھیں۔ یک پسر دارد وہی نا؟

پھر آغا ہمدانی تو ایران ایر کی کوچ کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے ماہ پارہ کا فون آنے کے بعد شب آویز کے نام جو کھرا لکھا تھا وہ پرس سے نکالا' پرزے پرزے کر کے وہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور ہوٹل سے باہر آ گئی۔ اب سکون ہے۔ اب کسی چیز کا انتظار نہیں لیکن اب ماہ پارہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ کہتی ہے میں ایک آیا کو اپنی ماں کیسے بتاؤں۔ میرے پاس آ کر کیوں نہیں رہتیں۔ کیوں ڈھائی سو روپے مہینے پر نوکرانی بنی اپنی اوقات کھو رہی ہو۔ میرے پاس پیسے کی کمی نہیں...... لیکن ماہ پارہ کے ہاں دولت کی یہی فراوانی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ وہ ایک مشتبہ قسم کے ہوٹل میں رہتی ہے اور طرح طرح کے مشتبہ لوگوں سے اس کی دوستی ہے۔ کبھی کہتی ہے اپنے ایک عرب فرینڈ کے ساتھ بیروت جا رہی ہے۔ کبھی فون کرتی ہے کہ کیبرے ڈانس سیکھنے ہانگ کانگ جانے والی ہے۔ ہفتوں مہینوں غائب رہنے کے بعد صورت دکھاتی ہے تو لگتا ہے کوئی فلم اسٹار آ گئی۔ بڑھیا ولایتی کپڑے' قیمتی عطر' نت نئے ہیئر اسٹائل اور وگ' بے چارے بھائی لطیف خاں جو ورما صاحب کی طرح نیک دل آدمی ہیں مجھ سے بے حد ناراض ہیں' کبھی ملتے بھی نہیں۔ اور میں کیا منہ لے کر ان کے گھر والوں سے ملنے لالو کھیت جاؤں۔ ان سب کو ماہ پارہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے۔ میں ماہ پارہ سے ایک پیسہ نہیں لیتی مگر وہ تو یہی سمجھتے ہوں گے۔

اب جب کہ آغا شب آویز کی طرف سے بھی مکمل ناامیدی ہو چکی ہے مجھے ماہ پارہ کے ساتھ رہنے کی کیا عار ہے۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔ کیا اماں' ہرمزی خالہ اور میں نے ساری عمر وہی نہیں کیا جو اب ماہ پارہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر بڑے اسٹائل سے کر رہی ہے۔ میری جاپانی میم جسے مجھ سے بے حد ہمدردی ہے مجھے بتایا کرتی ہے کہ ٹوکیو میں ایک پورا علاقہ بے حد شاندار گینزا ڈسٹرکٹ کہلاتا

ہے جس میں جاپان کی ہزاروں ہزار لڑکی انہیں اشغال میں مصروف ہے اور پرانے فیشن کی باوقار گیشا گرلز کی جگہ لے چکی ہے۔

ٹھیک ہے۔ پھر مجھے ماہ پارہ سے پیسے لیتے کیوں جھجک آتی ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم لوگوں نے "عزت" اور "وقار" کا ایک پردہ اپنے سامنے آویزاں کر رکھا تھا۔ گو وہ پردہ ٹاٹ کا تھا اور ٹٹی دھوکے کی۔ وہ دھوکہ ہم اپنے آپ کو بھی دیتے تھے اور دوسروں کو بھی اور وہ کیا انوکھی وضعداری تھی۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے ایران میں "خانگی" طوائف ہی کو کہتے ہیں۔ اب ایک علی الاعلان "ہائی کلاس پارٹی گرل" کی کمائی کھاتے مجھے شرم آتی ہے۔ کس قدر غیر منطقی اور بے تکی بات ہے اور ماہ پارہ کی طرف سے تشویش بڑھتی جارہی ہے۔ ہماری وہ تنگ و تاریک گلیاں محفوظ تھیں اور انسان اتنے درندے نہیں تھے۔ آج یہ باہر کی کھلی فضائیں اور یہ جگمگاتی دولت مند موڈرن دنیا بے حد پر خطر ہے اور انسان زیادہ کمینے ہو چکے ہیں۔

بہر کیف، میں اپنی قسمت پر پیچ و تاب کھاتی ہوں اور شاید قسمت ہی سے انتقام لینے کی خاطر ماہ پارہ سے کسی قسم کی مدد نہیں لیتی۔

ایک روز اتفاقیہ آغا فرہاد کی چھوٹی لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ میری جاپانی میم اپنی کسی امریکن سہیلی سے ملنے گئی تھیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ پڑوس کی عالی شان سہ منزلہ کوٹھی کے پھاٹک پر آغا فرہاد کے چھوٹے داماد کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ میری میم صاحب امریکنوں سے ملنے ان کے ہاں گئیں۔ میں باہر دھوپ میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے پڑوس کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ کوٹھی تھی کہ محل کا محل۔ جیسے امریکن رسالوں میں تصویریں ہوتی ہیں۔ برآمدے میں پہنچی۔ سنگ مرمر کا فرش۔ اندر جھانکا سفید "وال ٹو وال" کارپٹ۔ نہایت بڑھیا فرنیچر۔ آغا فرہاد کی لڑکی سامنے ہی نظر پڑی۔ میں فوراً پہچان گئی۔ کئی بار لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ وہ سفید رنگ کے ٹیلی فون پر جھکی "چین ڈیل۔ چین ڈیل" کہہ رہی تھی۔ جی ہاں ہم نے سیکنڈ فلور کے لیے چین ڈیل کا فرنیچر آرڈر کیا ہے۔ تھرڈ فلور کے

صرف چھ کمروں کے لیے کوئی این فرنیچر چاہیے۔ جی ہاں۔ ہم نے سارا سامان یوروپ سے منگوایا ہے۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ درشتی سے پوچھا کیا ہے؟ کیا چاہتے ہو......؟ میں نے کہا کچھ نہیں بیگم صاحب۔ آپ کی آیا سے ملنے آئی تھی۔ اس نے جواب دیا......ادھر جاؤ۔ اندر کہاں گھسی آتی ہو...... میں برآمدے سے اتر کر ٹہلتی ہوئی پھاٹک سے باہر آ گئی۔

میری جاپانی میم بہت اچھی عورت ہے۔ اس نے کہا ہے یہ خط اپنی ماں کو ٹوکیو بھیج دے گی۔ اس کی ماں اسے تمہارے پتے پر انڈیا ری ڈائریکٹ کر دے گی۔

خالہ خالو کو دست بستہ آداب۔ ورما صاحب اور صدف کو سلام۔

آفتاب بیٹے کو پیار۔ تمہیں پیار۔

جمیلن دعا کرو ماہ پارہ راہ راست پر آ جائے۔ اب سنا ہے وہ اسمگلروں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ میں تو دعائیں مانگتے مانگتے بھی تھک کے چور ہو گئی۔

تمہاری بجیا۔

یہ خط بھی مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا۔ کیونکہ جاپانی میم نے اسے اپنی ماما سان کو ٹوکیو بھیجا اور اس جاپانی ضعیفہ نے دوسری ڈاک کے ساتھ اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا اور اسے انڈیا پوسٹ کرنا بھول گئی۔

(10)

پاکستان کے اردو اخباروں کی ایک سرخی ...... کلفٹن پر نوعمر حسینہ کا پراسرار قتل، قاتل مفرور ہیں۔ لڑکی کی لاش صبح چار بجے کے قریب ساحل پر پڑی پائی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی غالبًا اسمگلروں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ماں ایک غیر ملکی کے ہاں گھریلو ملازمہ ہے۔ تحقیقات کے بعد جس وقت اس عورت کو لڑکی کی لاش شناخت کرنے کے لیے بلوایا گیا وہ ہسٹریائی انداز میں چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ "ورما صاحب آپ کی امراپالی مر گئی۔ ورما صاحب آپ کی امراپالی کو مار ڈالا......" اس وجہ سے یہ شبہ ظاہر کیا جا

رہا ہے دونوں ماں بیٹیاں بھارتی جاسوس تھیں۔ تحقیق و تفتیش جاری ہے۔

(11)

پولیس کے مردہ گھر کا ایک منظر۔

"متوفیہ کے باپ کا نام؟" پولیس افسر پوچھتا ہے۔

"باپ کا نام......؟ قدرت خدا لکھ لیجئے۔

"عجیب نام ہے۔"

"ہر نام عجیب ہوتا ہے۔"

"قدرت خدا بنگالی معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ متوطن کلکتہ۔ غالباً اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔"

"ان کی کیا قومیت تھی......؟"

"برٹش۔"

"مقتول کا پاسپورٹ نمبر......؟"

"صفر...... صفر...... صفر۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"لاش کا پاسپورٹ......؟ زیرو...... زیرو...... زیرو......"

"کیا اب پھر دورہ پڑنے والا ہے؟"

"لاش کا پاسپورٹ...... ہاہاہا...... صفر ہے دشوار' خواب کب تک...... بہت بڑی منزل عدم ہے...... ہاہا...... نسیم جاگو۔ کمر کو باندھو...... اٹھاؤ بستر...... اجی اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے۔"

عورت اب گانا شروع کر دیتی ہے۔ پولیس کے لوگ اسے تعجب سے دیکھتے ہیں...... "جوانی و حسن' جاہ و دولت...... یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے۔ اجل ہے استادہ دست بستہ' نوید رخصت ہر ایک دم ہے...... بسان دست سوال سائل تہی ہوں ہر ایک مدعا سے...... تہی ہوں ہر ایک مدعا سے...... تہی ہوں ہر ایک مدعا سے......" عورت اب گراموفون ریکارڈ پر اٹکی ہوئی سوئی کی طرح بے

تکان دہرا رہی ہے۔ "سفر ہے دشوار...... سفر ہے دشوار۔"

"بہت بڑی منزل عدم...... عدم...... عدم...... اجی چھاپ تلک سب چھینی موسے نینا لگائے کے ...... چھاپ تلک...... خسرو نظام کے بل بل جاؤں ...... بل بل بل بل بل بل۔" اس نے پھرکی کے مانند چکر لگانا شروع کر دیا۔ اس کا جوڑا کھل گیا اور لانبے بال شانوں پر بکھر گئے۔ اب وہ زبان نکال کر لٹو کی طرح گھومنے لگی...... جیسے زندگی کے مرگھٹ پر کالی رقصاں ہو۔

دو سپاہی اسے بدقت پکڑ کر باہر ایمبولیس کی طرف لے گئے۔

(12)

نوراسلام مسافر خانہ محمد علی روڈ بمبئی کے کلرک نے پوچھا

"پاکستانی؟" اور رجسٹر کھولا۔

"پتہ نہیں پاکستانی کہ ہندوستانی۔ دراصل جہنمی......"

کلرک نے نووارد عورت کو تعجب سے دیکھا۔

"آپ نے مجھے پاکستانی کیوں سمجھا؟...... کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے۔"

"جی نہیں۔ بیگم صاحب آپ چاروں طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے پاکستانی جو پہلی بار یہاں آتے ہیں' ہر چیز کو شبے کی نظروں سے......"

"میں ساری دنیا کو شبے کی نظروں سے دیکھتی ہوں...... کیا پتہ آپ بھی ابھی جاسوس سمجھ کر مجھے حوالات میں بند کروا دیں۔ دیوانی قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیں...... میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر میری لاش ساحل پر پھینک دیں۔ میرا زیور لوٹ کھائیں...... مجھے فریب میں مبتلا رکھیں...... میرے منہ پر کالک پوت دیں۔ میں ہزاروں خط لکھوں' ایک کا جواب نہ دیں۔"

کلرک گھبرا کر منیجر کو بلانے کے لیے اٹھا۔

"گھبرایئے نہیں۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دیکھ لیجئے۔" اس نے پرس کھولا...... پھر بند کر دیا۔ "ایک فون کر سکتی ہوں......؟"

"ضرور......" کلرک نے کہا۔

عورت ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کرنے لگی۔ چند منٹ بعد اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو...... ہیلو...... شیخ طاؤس ہیں؟"

"جی میں حاضر ہوں۔ فرمائیے کون صاحب؟"

"میں رشک قمربات کررہی ہوں۔"

"اوہو...... رشک قمر صاحبہ...... یہ عید کا چاند کہاں سے نکل آیا۔ سنا تھا آپ کراچی چلی گئی تھیں۔"

"جی ہاں۔ ابھی آج صبح دس بجے ہی وہاں سے واپس آئی ہوں۔"

پچیس برس قبل جب وہ آغا فرہاد کے ساتھ بمبئی آئی تھی شیخ صاحب کے ہاں کئی محفلیں رہی تھیں۔ شیخ طاؤس بھی اس زمانے میں افسانے لکھتے تھے اور شعر کہتے تھے۔ طاؤس تخلص تھا۔ عرصے سے ادب سے تائب ہو چکے تھے اور اب لوہے کے بڑے بھاری بیوپاری تھے، مگر گاہے بہ گاہے ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے اور شاعروں وغیرہ کی سرپرستی فرماتے تھے۔ "تو فرمائیے کب ملیں گی؟"

انہوں نے پوچھا: "اتفاق سے غریب خانے پر کل ہی ایک نشست ہے۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"نور اسلام مسافر خانہ......"

"اوہ......"

اگر وہ ادبے رائے شیرٹن یا تاج میں ٹھہری ہوتی تو شیخ طاؤس کہتے میں خود کار لے کر آپ کو لینے آؤں گا۔ اب انہوں نے ذرا سرد مہری سے جواب دیا۔ "اچھا تو کل آپ سات ساڑھے سات تک آجائیے۔ میں ورلی سی فیس پر رہتا ہوں۔ آپ کو بس آسانی سے مل جائے گی۔ میرا پتہ لکھ لیجئے۔"

دوسری شام وہ مسافر خانے کے کلرک سے بسوں کے نمبر دریافت کر کے ایک بس سٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔ بہت لمبا کیو تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک

غلط بس پر چڑھ گئی۔وہ بمبئی کے راستوں سے نابلند تھی۔غلط بس اسٹاپ پر اتر گئی۔ دوسری بس میں سوار ہوئی۔اس نے حاجی علی پر اتار دیا۔اس وقت تک وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ تازہ دم ہونے کے لیے سمندر کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک ٹاپو پر حاجی علی کی خوبصورت سفید درگاہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ جمعرات کی شام تھی اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ پانی میں بنے ہوئے طویل پختہ راستے پر سے گزرتے درگاہ کی سمت جا رہے تھے۔اس نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ایک برقعہ پوش عورت سے ورلی سی فیس کا راستہ پوچھ کر پیدل چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ایک عالی شان عمارت کے سامنے پہنچی۔ شیخ طاؤس کا بڑھیا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔ ڈرائنگ روم میں محفل ناؤ و نوش گرم تھی۔ رشک قمر اپنے کھچڑی بالوں، معمولی ساری، بجھی ہوئی شخصیت کی وجہ سے میونسپلٹی کی اسکول ٹیچر معلوم ہو رہی تھی۔ بلکہ ان میں سے ایک نے تو پوچھ بھی لیا "کیا آپ کسی اسکول میں پڑھاتی ہیں؟" صاحب خانہ اور الٹرا فیشن ایبل بیگم طاؤس نے بھی کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہ کیا اور ایک دو غزلیں سن کر مہمانوں نے رسمی واہ واہ کے بعد نظر انداز کر دیا۔وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی رہی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔لوگ ڈنر کے لیے اٹھے۔اس وقت ایک صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔وہ دل ہی دل میں ان کی بہت مشکور ہوئی۔وہ پلیٹیں لے کر اس کے ساتھ سمندر کے رخ ایک دریچے میں آ بیٹھے۔ وہ خان صاحب خان صاحب کہلا رہے تھے اور نہایت معقول اور بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے۔کھانا ختم کرتے ہی انہوں نے صاحب خانہ سے اجازت چاہی۔"مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ایک جگہ پہنچنا ہے۔میں کولابہ میں رہتا ہوں۔آپ کہاں جائیں گی؟" انہوں نے رشک قمر سے دریافت کیا۔

"محمد علی روڈ۔"

"مجھے بھی ساؤتھ بومبے جانا ہے۔ لیکن راستے میں ذرا سا کام ہے۔اس کے بعد آپ کو پہنچا دوں گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

وہ نیچے آ کر خان صاحب کی کار میں بیٹھی۔ خان صاحب نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا:

"قمر صاحبہ...... میں امپر لیاریو ہوں۔ Artists میں Deal کرتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ محض رسمی قسم کی شاعرہ نہیں' پرفورمنگ آرٹسٹ ہیں یا رہ چکی ہیں۔

اور اس وقت کسی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔ کیا میں، آپ کی کسی طرح سے مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ نے شاید سنا ہو میں ایک زمانے میں ریڈیو پر گایا کرتی تھی۔"

خان صاحب نے کار چلاتے چلاتے چٹکی بجائی۔ "دیریو آر...... میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا...... اگر آپ مناسب سمجھیں اپنی پریشانی کی وجہ بتلا دیں...... یو سی...... مسز قمر۔ میری جوائن ہے' اس میں میں نے آرٹسٹوں کی دکھی زندگیوں کے اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ میرے اندر...... یوں کہنا چاہیے کہ اب ایک قسم کی وسعت نظر آ گئی ہے اور جس طرح انسان انسان کو ستاتا ہے اس کی کمینگی اور ذلالت پر اب میں متحیر بھی نہیں ہوتا۔"

"نہیں میرے حالات تو ٹھیک ہیں' صرف سفر کی تکان ہے۔"

خود دار عورت ہے۔ خان صاحب نے دل میں سوچا۔ خاموشی سے راستہ طے کرنے لگے۔ میرین ڈرائیو پر سے گزرتے ہوئے انہوں نے گھڑی دیکھی اور کہا: "آیئے کہیں چل کر کافی پی لیں۔" وہ اوبیرائے شیرٹن پہنچے...... ریسٹوران میں جا کر کافی کا آرڈر دیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ شریف اور درد مند آدمی ہیں۔ ورما اور لطیف خاں کی طرح۔ رشک قمر نے سوچا' پھر خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

"میرے شوہر مجھے چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے۔ میں ان کے رشتے داروں کے پاس کراچی گئی۔ لڑکی کو لے کر۔ وہاں اس کی شادی کر دی۔ اب واپس آ گئی ہوں۔"

جہاندیدہ خان صاحب اس کی آواز سے سمجھ گئے کہ وہ سچ نہیں بتا رہی۔ مزید کرید کر کے اسے مضطرب کرنے کے بجائے نرمی سے دریافت کیا: "اب کیا ارادہ ہے؟"

"پتہ نہیں۔ لکھنؤ جا کر سوچوں گی۔"

"آپ قوالی گانا پسند کریں گی؟" پھر خود ہی فوراً خیال آیا کہ یہ اسٹیج پر غمزہ و ادا کے ساتھ قوالی گانے کی عمر سے کافی آگے نکل چکی ہیں۔

رشک قمر نے مسکرا کر کہا: "یہ ایس سن و سال میں قوالی گاؤں گی؟"

"کیوں نہیں۔" خان صاحب نے بات بنانے کی خاطر جواب دیا۔ "شکیلہ بانو بھوپالی برسوں سے گا رہی ہیں۔ نور جہاں۔ رضیہ بانو۔ شکیلہ بانو اور نور جہاں تو انگلینڈ کا دورہ بھی کر چکی ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ "آیئے چلیں، سامنے ہی جانا ہے۔"

وہ ہوٹل سے نکل کر نریمان پوائنٹ کے ایک تھیٹر ہال پر پہنچے جہاں "مجرا کیبرے کمپی ٹیشن" کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ وہ اندر گئے۔ اسٹیج پر ایک لڑکی سنہرا وگ پہنے انتہائی لچر رقص کر رہی تھی۔

"اسے بیلی ڈانس کی الف بے بھی نہیں آتی۔"...... خان صاحب نے کوفت سے کہا۔

اور لوگ اتنے مہنگے ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے آتے ہیں۔"

"جی ہاں زیادہ تر انڈر ورلڈ کے لوگ...... اور گلف کے عرب...... آیئے چلیں۔"

وہ اٹھ کر باہر آئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور سمندر کی اونچی لہریں ساحلی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر سناٹا طاری تھا۔ برساتی میں ایک آدمی اوور کوٹ میں چہرہ چھپائے چپ چاپ کھڑا تھا...... اس نے رشک قمر سے فرنچ میں کچھ کہا۔ وہ گھبرا کر خان صاحب کے نزدیک دبک گئی۔

بمبئی کی انڈر ورلڈ بہت خطرناک ہے۔ آیئے یہاں سے نکل چلیں......"

خان صاحب بولے۔

"موسیو...... مادام......" اس آدمی نے بے بسی سے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں کہا...... "میں ماریشس سے آیا ہوں۔ ایک شخص نے میری جیب کاٹ لی۔"

خان صاحب اور رشک قمر سرعت سے کار میں جا بیٹھے۔ سامنے ایک نامی گرامی اسمگلر کی کیڈی لیک آکر رکی۔ وہ اپنے گرگوں کے ساتھ جھومتا جھامتا اترا...... خان صاحب نے اپنی کار اسٹارٹ کی...... "بمبئی کی انڈر ورلڈ......" انہوں نے دہرایا۔

"خان صاحب...... میری بچی کراچی کی انڈر ورلڈ میں ماری گئی......" اس نے کہا اور بے اختیار رونے لگی۔

خان صاحب نے کار کی رفتار دھیمی کی اور نرمی سے بولے۔ "مجھے پورا واقعہ بتلا دیجئے۔" تب اس نے پوری داستان ان کو مختصراً سنائی۔

"...... پھر سپاہی مجھے ہسپتال لے گئے اور جاپانی صاحب کو اطلاع کی۔ اس بے چارے نے مجھے ایک مینٹل ہوم میں داخل کروایا...... الیکٹرک شوک لگائے گئے...... چار پانچ مہینے علاج ہوا۔ جاپانی نے سارا خرچہ اٹھایا۔ وہ ٹوکیو لوٹنے والے تھے۔ مجھ سے کہا مجھے کسی اور جاپانی یا امریکن کے ہاں نوکر رکھوا دیں گے۔ تب ہی میرے پاس مسقط سے پوسٹ کیا ہوا جمیلن کا چار سطروں کا پرچہ پہنچا کہ وہ سخت بیمار ہے اور اس کی دیکھ بھال اور مالی اعانت کے لیے کوئی موجود نہیں۔ میں رات بھر دن بھر روتی رہی۔ جاپانیوں نے میری یہ حالت دیکھ کر اور اس خط کی بنیاد پر میرے لیے پروانہ راہداری کی تگ و دو کی۔ اس میں ایک سال لگ گیا۔ اجازت ملتے ہی میرے لیے جال کا ٹکٹ خریدا۔ ایئرپورٹ پر مجھے خود پہنچانے آئے۔ میرا رواں رواں جاپانی میاں بیوی کو دعائیں دیتا ہے۔

"روانگی سے ایک دن قبل ماہ پارہ کو خدا حافظ کہنے قبرستان گئی تھی۔ بہت دیر تک اس کی کچی قبر کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اچانک بہت گہما گہمی شروع ہو گئی۔ کسی وی آئی پی کا جنازہ جا رہا تھا۔ ٹیلی ویژن کیمرے، پریس رپورٹر، پھولوں

کی بڑی سیاہ ربنوں والے ری تھ' سفید شفون اور جارجٹ کی ساریاں سفید سینڈلز پہنے' سفید پرس سنبھالے' سیاہ چشمے لگائے' ہلکا سا میک اپ کیے' نفاست سے سر ڈھانپے سوگوار بیگمات۔ میں بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ رستے میں جنازے کے جلوس میں آئی ہوئی شاندار امپورٹڈ کاروں کی اتنی طویل قطار تھی کہ میں ان کے گزرنے کے انتظار میں سڑک کے کنارے ایک سنگ میل پر بیٹھ گئی۔ ایک کار میں سے ایک سفید شفون کی ساری اور سیاہ چشمے والی بیگم اتریں۔ مجھے کوئی بھکارن سمجھ کر میرے سامنے چند سکے پھینکے۔ بلجیم کی لیس کے سفید نازک رومال سے اپنی ناک کی نوک چھوتی آگے بڑھ گئیں۔"

"رشک قمر...... آپ نے ابھی بتلایا تھا کہ آپ کا ایک لڑکا بھی ہے۔"

"جی ہاں۔ اسے اسکول میں پڑھانے کے لاکھ جتن کیے لیکن وہ لکھنؤ کی گلیوں میں آوارہ گردی کا شوقین تھا۔ اب کراچی میں کسی لکھنؤ سے آنے والے نے بتایا تھا کہ وہ بمبئی میں داداگیری کر رہا ہے۔ میں کل صبح سے جب سے یہاں پہنچی ہوں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں' شاید وہ کہیں نظر آجائے' مگر ایسے اتفاقات صرف ہندوستانی فلموں میں ہوتے ہیں۔"

کار اب نور اسلام مسافر خانے بھنڈی بازار پہنچ چکی تھی۔ خان صاحب نے آہستہ سے کہا۔ "آپ پاکستان سے تو کچھ روپیہ ساتھ لا نہ سکی ہوں گی۔"

"ایک پیسہ نہیں۔ میرے ہاتھ میں یہ دو سونے کی چوڑیاں ہیں۔ کل صبح انہیں فروخت کر کے لکھنؤ کا ٹکٹ خریدوں گی۔ مسافر خانے کا کرایہ بہت سستا ہے۔ صرف تین روپے روز۔"

خان صاحب کا ہاتھ ان کے کوٹ کی جیب کی طرف گیا...... "میں اگلے ہفتے اجمیر کے قوالوں کی ایک پارٹی کو لے کر مڈل ایسٹ اور انگلینڈ کے دورے پر جا رہا ہوں۔ اس وجہ سے بہت زیادہ اخراجات در پیش ہیں۔" انہوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔

کھسکے ڈبل...... کھسکے ڈبل...... کھسکے ڈبل...... رشک قمر عرف قمرن

عرف میلے والی امرتی نے دل میں دہرانا شروع کیا۔ خان صاحب نے کہا۔ "اس وقت صرف اتنا ہی پیش کر سکتا ہوں۔ ایک مخلص دوست کی طرف سے قبول کیجئے۔" اور بٹوے میں سے چند نوٹ نکالے۔

(13)

پڑوس کی مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی جس وقت وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اپنے آنگن میں داخل ہوئی' سامنے امرود کی ایک ٹہنی سے سائیکل رکشا کے پرانے ٹیوب اور ٹائر لٹکے نظر آئے۔ باورچی خانے کے آگے تین چار بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت نے کھپریل میں سے آواز دی...... "کون ہے؟" ...... اسباب ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ "جمیلن ...... جمیلن" پکارتی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ جلدی میں دہلیز سے ٹھوکر لگی۔ انگوٹھے میں چوٹ آگئی۔ اندر اسٹول پر رکھی لالٹین اندھی اندھی جل رہی تھی۔

"جمیلن...... خالہ...... ہم آگئے......"

بے حد بوڑھی' سوکھی لقاط ہر مزی خالہ میلے کچیلے بستر پر سے دھویں کی پتلی لکیر کی طرح اٹھیں' ان کے برابر بچھا جمیلن کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ اس کی بیسا کھی کمرے کے ایک کونے میں رکھی تھی۔ رشک قمر کا دل دھک سے رہ گیا۔

"خالہ۔ تسلیم......" وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر خالہ سے لپٹ گئی۔ وہ پھسر پھسر رونے لگیں۔

"خالہ...... جمیلن...... کہاں ہے؟"

عورت باورچی خانے سے نکلی۔ اپنے بچوں کے ساتھ مل کر رشک قمر کا اسباب ڈیوڑھی سے اٹھایا اور لا کر برآمدے میں چن دیا۔ خود میلی اوڑھنی سے پسینہ پونچھتی دہلیز میں آکھڑی ہوئی اور گھر کی نوواردمالکن کو دیکھنے لگی۔

"خالہ...... جمیلن ...... ؟" رشک قمر نے دہل کر دہرایا۔

"اللہ کے گھر گئی۔" ہرمزی خالہ نے روتے روتے جواب دیا۔ "اس کے دونوں پاؤں بے کار ہو گئے تھے...... مولا نے اس کی مشکل آسان کی۔"

''جمیلن بٹیا تو بالکل ہل جل نہیں سکتی تھیں۔ یہ داگدر بلا کر لائے۔ وہ بولا سارے بدن کو یہ ہو گیا ہے۔ گٹھیا ہو گئی ہے۔ جوڑ جوڑ جکڑ گیا ہے......'' دروازے میں کھڑی عورت نے کہا۔

رشک قمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آخر وقت تک اس نے تمہارا انتظار کیا۔ اسے تو مرے بھی اب ایک سال ہو جائے گا۔'' خالہ بولیں۔

رشک قمر گم صم باری باری ان دونوں کی صورتیں دیکھا کی۔ ایک آنسو آنکھ سے نہ ٹپکا۔ اس نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''خالہ...... تم نے ہمیں اطلاع بھی نہ بھیجی۔''

''بیماری کی اطلاع تو بتول کا دیور مسقط جا رہا تھا' اس کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ وہ بھی وہاں پہنچ کر لاپتہ ہو گیا۔ ہمارا کون سگا ولایت میں بیٹھا ہے جس کے ذریعے خط و کتابت کرتے۔''

رشک قمر سر جھکائے جمیلن کے خالی کھرے پلنگ کو تکتی رہی۔ تعجب کی بات ہے جمیلن کی موت کی خبر پر میری آنکھوں سے ایک آنسو نہیں گرا۔ کیا ماہ پارہ کی وفات...... نہیں قتل...... پر آنسوؤں کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔ میں روئی نہیں تو جیوں گی کیسے؟ اچانک اسے جمن خالو یاد آئے۔ شاید ابھی نماز پڑھ کر مسجد سے نہیں لوٹے۔

''خالہ...... خالو کیسے ہیں؟''

''کون...... تمہارے خالو...... ان کو مرے پانچ سال ہو گئے۔ جمیلن مرحومہ نے تمہیں مفصل خط میں اطلاع دی تھی۔''

''مجھے کوئی خط نہیں ملا خالہ...... کہیں سے کوئی خط نہیں آیا میرے نام۔''

ہرمزی خالہ۔ جمن خالو۔ رشک قمر لکھنوی۔ جمیل النساء بیگم عرف کماری جل بالا لہری...... ماہ پارہ خانم...... ہم سب ایک دلدل میں پھنسے ہوئے

ہیں۔ پھنسے ہوئے تھے۔ دلدل میں پھنسا آدمی باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، روتا نہیں۔ اسے رونے کی فرصت نہیں ہوتی، وہ دلدل سے نکلنے کی کوشش میں جٹا رہتا ہے...... جمن خالو۔ جمیل النساء۔ ماہ پارہ خانم تینوں دلدل میں دھنس گئے۔ اس نے اپنی خشک آنکھوں پر انگلیاں پھیریں۔

"جمیلن...... کب...... کیسے مری...... خالہ......؟"

"آدمی کیسے مرتا ہے بٹیا......؟ بس مر جاتا ہے۔ جمیلن نے رات کے وقت دم توڑ دیا۔ تاریخ اور مہینہ ہمیں یاد نہیں۔ بھری برسات تھی۔ گھر میں کفن دفن کے لیے ایک پیسہ نہ تھا۔ بفاتی کہیں سے بیس روپے قرض لائے۔ کہنے لگے محلے والوں سے چندہ کر لوں۔"

"بفاتی کون......؟"

"حفیظن کے میاں...... رکشا چلاتے ہیں۔ جمیلن نے کرائے دار رکھ لیا تھا۔ جب سے وہ پلنگ سے لگی گانے کے لیے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ورما صاحب اور صدف آراء امداد کرتے رہتے تھے۔ ورما شادی کر کے لکھنؤ سے اڑنچھو ہوئے۔ صدف کسی گورے کے ساتھ ولایت چلی گئیں۔ بفاتی نے کہا مسجد میں جا کر چندہ جمع کریں۔ ہمارا دل نہ مانا۔ آنکھ پر ٹھیکری رکھ کر انہیں آغا فرہاد کے ہاں بھجوایا۔ بارش کہے آج برس کے پھر نہ برسوں گی۔ فرہاد میاں خود بیمار پڑے تھے۔ انہوں نے اپنے منشی کے ہاتھ پیسے بھجوائے۔ سب کفن دفن کا انتظام اس نے کیا۔ موسلادھار بارش میں لے جا کر غریب کی مٹی عزیز کی۔"

"اب گزر کیسے ہوتی ہے......؟"

"جمیلن مرحومہ پڑے پڑے چکن کاڑھ کر بیس روپے مہینہ پیدا کر لیتی تھی۔ پندرہ روپے مہینہ بفاتی کرایہ دیتے تھے۔ اب جمیلن کے مرنے کے بعد کرائے کے بجائے ہمیں دو وقت دال بھات کھلا دیتے ہیں۔ رکشا کھینچتے کھینچتے ٹی بی ہو گئی ہے۔ پھر بھی ان کی پوری نہیں پڑتی۔ چار بچے، دو میاں بیوی۔ اب بیچارے ہمیں بھی سال بھر سے کھلا رہے ہیں۔ شکر ہے تم یہ مکان خرید گئی تھیں

ورنہ اس کا کرایہ کہاں سے ادا ہوتا......" دفعتہً ان کو ماہ پارہ یاد آگئی۔ پوچھا: "اے قمرن...... بٹیا کہاں ہیں...... وہ ساتھ نہیں آئیں......؟"

"ماہ پارہ کی کراچی میں شادی کردی ہے خالہ...... بہت اچھا لڑکا مل گیا...... نیک...... شریف...... تعلیم یافتہ...... اچھی تنخواہ پاتا ہے۔" رشک قمر نے کرخت آواز میں کہا۔

"شکر ہے...... مولا تیرا شکر ہے۔ الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" وہ پلنگ سے اٹھنے لگیں۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"وضو کرنے......"

"خالہ...... لیٹ جاؤ۔ کل پڑھ لینا۔" اس نے ہرمزی بیگم کو پھر بستر پر لٹا دیا۔ وہ وفور مسرت سے دوبارہ اٹھ بیٹھیں...... رشک قمر نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے پوچھا...... "تم کہہ رہی تھیں آغا فرہاد بیمار پڑے ہیں......"

"ارے انہیں کوئی جان لیوا مرض لگ گیا ہے۔ بڑے داماد کے پاس علاج کے لیے ولایت گئے ہیں۔ بڑا داماد وہاں ڈاکٹر ہے۔ بیوی اور منجھلی بیٹی داماد بھی ساتھ گئے ہیں۔ چلتے وقت دو سو روپے بھجوا گئے تھے اور تمہارے نام ایک بڑا لفافہ تھا۔ ابھی دیتے ہیں۔ ذرا لالٹین اٹھانا۔"

ہرمزی خالہ نے پھر اٹھنا چاہا۔

"خالہ مجھے بتاؤ میں ڈھونڈ لوں گی۔"

"وہ سابکسا کھینچنا......"

قمرن نے جمیلن کی چارپائی کے نیچے سے سرخ ٹین کا پھول دار پرانا بکس کھینچ کر باہر نکالا۔ اس میں جمیلن کے کپڑے رکھے تھے۔ وہ آغا فرہاد کا لفافہ ڈھونڈنے کے لیے کپڑے نکال نکال کر فرش پر رکھتی گئی۔ ٹرنک کی تہہ میں پرانا اخبار بچھا تھا۔ اس کے نیچے سے گلابی پلاسٹک کے دو کلپ نکلے جو اس نے مدتیں گزریں پیر بنڈے شاہ کے عرس میں چار چار آنے میں اپنے اور جمیلن کے لیے

خریدے تھے۔ان کو کچھ دیر تک تکتی رہی۔ خالہ کی آواز پر چونک اٹھی۔اب وہ کہہ رہی تھیں "آفتاب بھی غائب ہو گیا۔ بمبئی بھاگ گیا۔"

رشک قمر پھر آغا فرہاد کا لفافہ تلاش کرنے میں مصروف ہوئی۔ وہ جمیلن کے ایک ادھ بنے سوئٹر کے نیچے رکھا ملا۔ بہت بھاری تھا۔ قمرن کے دل میں روشنی سی پیدا ہوئی۔ شاید نوٹوں کی گڈی بھجوا گئے ہوں۔ جلدی سے جمیلن کی کھاٹ پر آ بیٹھی۔ اسٹول کھینچ کر قریب رکھا۔ لالٹین کی بتی اونچی کی۔ لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ ایک مراکو لیدر کی نفیس بیاض برآمد ہوئی اور ایک خط۔ اس نے خط پڑھنا شروع کیا:

رشک قمر!

ہم جمیل النساء مرحومہ کی تعزیت تم سے کن الفاظ میں کریں۔ ہمیں تمہارا کراچی کا پتہ معلوم نہیں، ورنہ وہاں خط بھیجتے۔ چاہے تم جواب نہ دیتیں۔ پچیس سال گزر گئے لیکن ہم تمہیں بھولے نہیں جو تمہاری ہماری قسمتوں میں لکھا تھا سو پورا ہوا۔ تمہیں لکھنؤ سے گئے بھی پانچ چھ برس ہونے آئے۔ تمہارے جانے کے بعد ہم نے جمیل النساء کی کئی بار مالی امداد کرنا چاہی، انہوں نے ہمیشہ روپے واپس کر دیئے۔ اس قدر کی غیور لڑکی ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ ساری عمر زندگی سے لڑتی رہی، پھر موت سے لڑا کی۔ آخر میں دونوں سے ہار گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے دوسری دنیا ہی میں آرام اور چین نصیب کریں۔

رشک قمر! پچھلے چند برسوں میں تم ہمیں بے طرح یاد آئیں۔ اب ہم بھی بڈھے ہو چلے۔ بیوی اپنے میکے اور سسرال کی سیاست میں مشغول رہتی ہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ اللہ نے ہمیں گھربار، اولاد، دولت، آسائش سب کچھ دیا، چین کا چین نہ دیا۔ ہم نے تمہارے لیے بہت سی غزلیں کہیں۔ ایک بیاض میں لکھتے ہیں۔ سب ایک بیاض میں لکھتے گئے۔ اس امید پر کہ شاید یہ کبھی تمہارے ہاتھ پہنچ جائے۔ شاید تم کبھی لکھنؤ لوٹ آؤ۔ پبلک کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر تم واپس آؤ اور مشاعروں میں مدعو کیا جائے (اب ہماری سوسائٹی

کافی وسیع النظر ہو چکی ہے) تو یہ غزلیں تمہارے کام آئیں گی۔

اور کیا لکھیں رشک قمر! ڈاکٹروں نے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ ہم اپنے بڑے داماد کے پاس بغرض علاج لندن جا رہے ہیں۔ اب کیا اچھے ہوں گے اور کیا زندہ واپس آئیں گے۔ رشک قمر اب خدا حافظ۔ اگر ممکن ہو ہمیں معاف کر دینا۔

تمہارا آغا فرہاد

(14)

بمبئی والے خان صاحب کی دی ہوئی رقم میں سے اب صرف دس روپے باقی تھے۔ رشک قمر صبح کو پرانی عادت کے مطابق ڈاکیے کے انتظار میں ڈیوڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد اچانک خیال آیا۔ میں بھی کتنی بڑی الو کی پٹھی ہوں۔ اٹھارہ انیس برس لندن کے خط کا انتظار کیا۔ اب تو سب طرف سے ہمیشہ کے لیے چھٹی...... وہ آنگن میں واپس آئی۔ بفاتی کی بیوی حفیظن باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ بفاتی صبح صبح کاڑھا چاء اور ایک سخت لکڑ توڑ پاؤ کا ناشتہ کر کے رکشا لے کر جا چکے تھے۔ بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ خالہ اندر پلنگ پر پڑی کھانس رہی تھیں۔ رشک قمر کھپریل میں آ بیٹھی اور سوچنے لگی۔ اب کیا کروں؟ آغا فرہاد کی بیاض یاد آئی۔ اندر سے اسے نکال کر لائی۔ ورق پلٹے۔ ہر غزل کے مقطع میں قمر تخلص موجود تھا۔ اس نے بیاض بند کی۔ تب ایک بڑا سا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک کر کتاب کی عنابی جلد پر ٹپ سے پڑا۔ وہ کچھ دیر تک سوچا کی پھر اٹھ کر کپڑے بدلنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔

بفاتی دوپہر کو کھانا کھانے ہانپتے ہانپتے گھر لوٹے۔ رشک قمر نے کھانے کے بعد ان سے پوچھا: "بفاتی ہمیں ذرا منصور نگر تک لے جاؤ گے۔"

"ضرور بٹیا...... چلئے۔"

وہ باہر آ کر رکشا میں بیٹھی...... وکٹوریہ اسٹریٹ، فرنگی محل، چوک، اکبری دروازہ، غلام حسین کا پل۔

''محرم آنے والا ہے۔ سنا ہے اس سال بھی شیعہ سنی سر پھٹول ہوگا۔''
بقاتی نے رکشا چلاتے چلاتے اظہار خیال کیا۔

''اب بھی برابر ہوتا ہے؟''

''ہر سال اور بہت زوروں میں۔ ابھی تین چار برس ادھر کی بات ہے بٹیا۔ ایران سے کچھ لوگ آئے تھے۔ اپنے ٹیلی ویژن کے لیے لکھنؤ کے محرم کی پکچر بنانے۔ یہاں پہنچے۔ یہاں ہو رہی تھی زبردست جنگ شیعہ سنی کی۔ الٹے پاؤں واپس گئے۔''

منصور نگر پہنچ کر وہ ایک پرانے مکان کے سامنے اتری۔ بیٹھک کے دروازے پر پہنچی۔ اندر ورما صاحب اور آغا فرہاد کے ایک متمول شاعر دوست اپنے حوالی موالیوں کے ساتھ بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''او ہو...... بی رشک قمر...... آپ کب تشریف لائیں۔''، وغیرہ وغیرہ۔
مزید چاء اور ناشتہ منگوایا گیا۔ رشک قمر نے ریل سے اترنے کے بعد سے اس وقت تک پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ دل چاہ رہا تھا سامنے رکھی ساری نعمتیں چٹ کر جائے۔ بڑی ہمت سے ہاتھ روکا۔ باتوں باتوں میں پوچھا: ''آج کل مشاعرے کہاں کہاں ہو رہے ہیں؟''

''ایک تو پرسوں شام ہی کو ہے۔ اتوار کے روز قیصر باغ کی بارہ دری میں۔ آپ آئیں گی؟''

''آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔''

''بات یہ ہے کہ اب ہم تو اس کی انتظامیہ کمیٹی سے الگ ہو گئے ہیں۔ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب اس کے سیکرٹری سے کہہ دیں گے۔ ارے میاں طاہر......''

طاہر میاں تولیہ سے منہ پونچھتے اندر سے نکلے۔ جھک کر رشک قمر کو تسلیمات عرض کی۔

''طاہر میاں! بی رشک قمر صاحب کو اپنے مشاعرے میں بلوالو...... تم تو

بجے تھے۔ ہمیں ان کا پڑھنے کا انداز اور آواز اب تک یاد ہے۔"

"بہت خوب بھائی جان۔ ہم انتظام کر دیں گے۔"

"کس وقت شروع ہو گا مشاعرہ......؟" رشک قمر نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم آدمی بھیج کر آپ کو بلوا لیں گے۔ اپنی کار بھیج دیں گے۔ مکان کا پتہ بتلا دیجئے......" طاہر میاں نے فرمایا۔

اتوار کی صبح سویرے سے اس نے مشاعرے کی تیاریاں شروع کیں۔ ٹرنک کھول کر ساریاں دھوپ میں ڈالیں۔ بلاؤز پر استری کی۔ بال سیاہ رنگے۔ سہ پہر کو آغا فرہاد کی بیاض نکال کر دو تین غزلیں منتخب کیں۔ ان کے ترنم کی دھنیں بٹھاتی رہی۔ حفیظن سے کہا کھانا سات بجے تک تیار کر دے۔ رشک قمر نے کافی عرصہ قبل مکان میں بجلی لگوالی تھی جو اس کے جانے کے بعد بل ادا نہ ہونے کی وجہ سے کاٹ دی گئی۔ سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے اس نے آنگن میں بیٹھ کر میک اپ کیا۔ کراچی میں خریدی ہوئی امریکن نائلون کی ایک پھولدار نیلی ساڑھی باندھی۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور طاہر میاں کی کار کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ آٹھ بجے۔ ساڑھے آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ ساڑھے گیارہ۔ اسے مشاعرے میں لے جانے کے لیے کوئی نہ آیا۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے بفاتی کو آواز دی۔ وہ برآمدے میں بیٹھے رکشا کے ٹائر میں ہوا بھر رہے تھے۔

"بفاتی......" اس نے ان کے قریب جا کر کہا۔ "جمیلن مرحومہ کس ٹھیکیدار کے لیے چکن کاڑھتی تھیں۔ جانتے ہو......؟"

"جی ہاں۔ جانتے ہیں بٹیا۔"

وہ باہر آ کر ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ حفیظن نے چنمٹ کی آرٹسٹک پیالی میں چاء پیش کی۔ اس نے چونک کر پوچھا: "یہ کہاں سے آئی......؟"

"صدف بٹیا چلتے وقت اپنے برتن دے گئی تھیں۔ سب بک گئے۔ یہی پیالی باقی بچی ہے۔" حفیظن نے کہا۔

''صدف بٹیااور ان کا امریکن خاوند جاتے وقت پیسے بھی دے گئے تھے وہ ایک مہینے کے اندر جمیلن بٹیااور خالہ کے علاج میں اڑ گئے۔'' بقاتی سر اٹھا کر بولے ..... ''امریکہ جاتے وقت صدف آراء تو بینک میں ان کا کچھ روپیہ تھا' وہ جمیلن بٹیا کے نام کرنے والی تھیں۔ بٹیا نے ان کو بہت سمجھایا کہ وہ یہ حماقت نہ کریں۔ کل کلاں انہیں لکھنؤ واپس آنا پڑا تو ضرورت ہو گی۔ وہ نہ مانیں۔ مگر عین وقت پر گاؤں سے ان کے لٹھ بند باپ بھائی آن پہنچے کہ اس روپے پر ہمارا حق ہے۔''

''صدف چلتے چلتے کہہ گئی تھیں کہ امریکہ سے روپیہ بھیج دیں گی مگر جمیلن بٹیا ہی نہ رہیں۔'' حفیظن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشک قمر اسی طرح دل کڑا کیے سنا کی۔

''پھر بٹیا کی بیماری کی خبر سن کر آغا فرہاد نے اپنے آدمی کے ہاتھ پیسے بھجوائے وہ انہوں نے لوٹا دیئے۔ دوسری بار ان کا سکتر پیسے لایا۔''

''آغا فرہاد کے ہاں اب سکتر بھی ہے؟'' رشک قمر نے پوچھا۔

''پورا عملہ ہے۔'' بقاتی نے اپنی نئی نویلی سائیکل رکشا کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''لاکھوں کا کاروبار ہے شاہجہاں پور میں غالیچے بنانے کا کارخانہ تو ان کا بہت برسوں سے چل رہا ہے۔ سیتاپور میں فارم لیا ہے۔ جائیداد کا کرایہ الگ آتا ہے۔ یہ بڑی جنگی کوٹھی بنوائی ہے مگر خدا کی شان۔ اتنی دولت اور نام چلانے کے لیے لڑکا ایک نہیں۔ سب کچھ دامادوں کو ملے گا۔''

رشک قمر چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسی مکان میں آغا فرہاد کا فرزند تولد ہوا تھا اور ورما صاحب نے فوراً اس کا نام نادر فردین رکھ دیا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر جاتا رہا۔ آج پچیس برس کا کڑیل جوان ہوتا ...... لیکن اگر زندہ رہتا تو بھی کیا ہوتا ...... کچھ بھی نہیں ...... آفتاب تو زندہ ہے ...... میری بد قسمتی ناقابل یقین ہے۔

حفیظن بالٹی اٹھا کر نل پر چلی گئی۔ رشک قمر نے جمیلن کے خالی پلنگ پر

نظر ڈالی۔

جمیل النساء تمہیں تمہاری خودداری نے ہلاک کیا.....اسے یاد آیا جمیلن کو آغا فرہاد سے تب سے نفرت ہو گئی تھی جب اس نے نادر فردین کی ولادت کے بعد سوئنگ برڈز کلب میں فرہاد کو ورما سے کہتے سن لیا تھا کہ اس طبقے کی چھوکریوں کے پاس بلیک میل کا یہ سہل ترین نسخہ ہے۔ کسی آئے گئے کی اولاد کسی مالدار شناسا کے سر منڈھ دی۔ قمرن کے پاس ثبوت کیا ہے؟ آغا فرہاد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تیز مزاج رئیس زادی وہپٹ بیوی سے بہت ڈرتے تھے اور سماج کے Lowest of the lowly سے اس کی ہمدردی ہوا ہو چکی تھی لیکن نادر فردین کے مرنے کے بعد اپنے اس رویے پر شدت سے نادم تھے۔ رشک قمر سے ملنا جلنا چھوڑ چکے تھے مگر دو سو روپے ماہوار ''پنشن'' مقرر کردی تھی جو اس نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی کہہ کر شکریے کے ساتھ قبول کی تھی۔ لیکن بلا کی ذہین اور اپاہج جمیلن اس پروفیشن میں کبھی داخل ہی نہ ہوئی تھی اور پلنگ پر پڑی پڑی اپنے صاف و شفاف ذہن سے دنیا کو آر پار دیکھا کرتی تھی۔ آغا فرہاد کے ان جملوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا۔

''پھر کیا ہوا لبفاتی......؟'' رشک قمر نے پوچھا۔

''فرہاد میاں نے تیسری بار روپے بھجوائے تو ہم نے چپکے سے لے کر رکھ لیے کہ ان کے لیے اچھا ڈاکٹر بلوائیں گے۔ اچھا کھانا پکوایا کریں گے۔ گھر کی حالت سدھرے گی۔ پوچھیں گی کہہ دیں گے لاٹری نکل آئی ہے یا کسی سے قرضہ لیا ہے' مگر ہمارے ایک بچے نے بھولے سے ان کو بتلا دیا۔ بہت بگڑیں چلائیں۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا' بٹیا ہم آپ کو فاقے کرتے' ایڑیاں رگڑر گڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتے۔

''ہماری رکشا ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے ہمارے بچوں کی قسم دے کر ہم سے کہا اس رقم سے نئی رکشا خرید لو۔ ہم تو مرنے ہی والے ہیں۔ تمہیں رکشا کے ذریعے اپنے کنبے کا پیٹ بھرنا ہے۔ مجبوراً ہم نے یہ رکشا خریدی جو پیسے بچے اس

سے بٹیا نے ہمارے بچوں کے کپڑے بنوا دیے۔ ارے وہ انسان تھیں کہ فرشتہ۔ مگر ضدی ایسی کہ ہسپتال میں بھرتی ہونے کو آخر دم تک تیار نہ ہوئی۔

"جب تک چل پھر سکتی تھیں گانے کے پروگرام مل جاتے تھے۔ پلنگ سے لگ گئیں تو چکن کاڑھنے لگیں۔ اس میں بیس روپے کما لیتی تھیں۔ بٹیا بھوک سے مریں۔ ہم جو دال بھات کھاتے تھے وہی انہیں کھلاتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے وہ بھوکی رہتی تھیں۔ کہتی تھیں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر ہمیں نہ کھلاؤ۔ دو نوالے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتیں۔ کہتیں ہمارا ہاضمہ خراب ہے۔ لالٹین کی روشنی میں چکن کاڑھتے کاڑھتے سو جاتیں۔"

رشک قمر پتھر کا بت بنی سنتی رہی۔ بقاتی رکشا کو جھاڑ پونچھ کر چلنے کے لیے تیار ہوئے' پھر خود ہی بولے: "یہ رکشا خرید کر ہم آغا فرہاد کو بتلا آئے تھے کہ بٹیا نے پیسے اب بھی نہیں لیے ہم کو دے دیے۔"

"بقاتی جمیلن کے ٹھیکیدار سے ہمارے لیے کام لا دو۔"

"بٹیا۔ آپ ریڈیو پر گائیے۔ پہلی تو گاتی تھیں۔"

اب ہماری آواز ریڈیو کے لائق نہیں رہی۔ ہم یہاں تھے جب ہی بہت عرصے سے گانا چھوڑ چکے تھے...... چکن بنانے کا ریٹ آج کل کیا ہے......؟"

"کرتوں کی ترپائی فی کرتا دس پیسے۔ ایک ساری کے پانچ دس یا پندرہ روپے۔ بھاری کام کے بیس پچیس۔ ایک نیا پیسہ فی مری۔ پتی۔ ایک آنہ فی پھول پکی کڑھائی۔ پتی میں جالی بنانے کا ایک نیا پیسہ۔ ایک نیا پیسہ فی شیڈ وورک۔ ایک نیا پیسہ فی بوٹی۔ ایک عورت ایک ساڑی نہیں بنا پاتی۔ ایک گھر میں مری پتی بنے گی۔ دوسرے میں شیڈ وورک تیسرے میں بیل جمیلن بٹیا مری پتی بناتی تھیں۔ بٹیا یہی ساریاں بازار میں اور فارن میں جا کر سینکڑوں میں بکتی ہیں۔ کاریگر بھوکے مرتے ہیں۔"

دوسرے روز صبح ساڑھے نو بجے ٹھیکیدار چار کرتے' ایک سفید ساڑی اور سفید دھاگہ لے کر ڈیوڑھی پر آیا۔ قمرن نے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے

سارا سامان لیا۔ ٹھیکیدار نے دھاگہ ناپ کر دیا کہ عورت کہیں دو تین گز اپنے پاس نہ رکھ لے۔ پھر وہ بقچہ سنبھال کو پڑوس کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

قمرن کھپریل میں آئی۔ بوسیدہ تخت کو جھاڑن سے خوب اچھی طرف صاف کیا۔ اس پر چادر بچھائی اور ساری اپنے سامنے پھیلا کر اس پر چھپے ہوئے بیل بوٹوں کو غور سے دیکھا۔ سوئی میں سفید دھاگہ پرویا۔ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ساری کا آنچل گھٹنوں پر پھیلایا اور بوٹا کاڑھنا شروع کیا۔

تب وہ دفعتاً اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

....

1976ء

قرۃ العین حیدر کی معرکۃ الآرا تصانیف

ناول:	آگ کا دریا، سفینۂ غمِ دل، آخرِ شب کے ہم سفر، گردشِ رنگِ چمن، میرے بھی صنم خانے۔
افسانے:	ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار۔
سوانحی ناول:	کارِ جہاں دراز ہے، (جلد اوّل، دوم، سوم) چار ناولٹ، سیتا ہرن، دلرُبا، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو۔
رپورتاژ:	کوہِ دماوند، گلگشت، جہانِ دیگر، خضر سوچتا ہے، ستمبر کا چاند وغیرہ۔
تراجم:	ہمیں چراغ ہمیں پروانے (پورٹریٹ آف اے لیڈی از ہنری جیمز)، آدمی کا مقدّر (میخائل شولوخوف) آلپس کے گیت (واسل بائی کوف) ماں کی کھیتی (چنگیز اعتمادوف) کلیسا میں قتل (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)، تلاش (ٹرومین کاپوٹ) وغیرہ وغیرہ۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KAUN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-8223-060-8